الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

عام لوگ ــــ اپنی بڑائی میں جیتے ہیں ــــ
مومن وہ ہے جو خدا کی بڑائی میں جینے لگے

اکتوبر ۱۹۸۵ شمارہ ۱۰۷

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	30/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	25/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	3/-
تعمیرِ ملت	3/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیاتِ اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	3/-
راہیں بند نہیں	3/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبرِ اسلام	2/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	3/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-
حل یہاں ہے	3/-
سچّا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیاتِ طیبہ	3/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	3/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عقل کا فیصلہ	
کاروان اسلام	
رازِ حیات	

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

اکتوبر ۱۹۸۵ □ شمارہ ۱۰۷

قیمت فی پرچہ	۳ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے :	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لیے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے بنک ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی AL-RISALA MONTHLY لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پردہ پھٹے گا

ٹائمس آف انڈیا (۲ جولائی ۱۹۸۵) میں دہلی کا ایک واقعہ شایع ہوا ہے جس کا عنوان ہے: اس سے زیادہ کہ ہضم ہو سکے۔ واقعہ کو ہم اخبار کے اصل الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

IT'S TOO MUCH TO STOMACH: Narain Das, 20, an alleged chain snatcher, swallowed his loot when he was given the chase in Greater Kailash yesterday. Narain Das removed a gold chain from around the neck of Ms Renu Saxena, a school teacher. According to the police, the incident occurred soon after Ms Saxena got off a bus while returning from Andrews Ganj. The suspect followed her for a short distance. Two passer-by, Mr Gian Prakash and Mr Sanjay Dutt Gupta, responding to Ms Saxena's cries, chased and overpowered the suspect. They were amazed when they were unable to find the chain. The mystery was solved when the police took the suspect to the AIIMS where an X-ray revealed the chain in his stomach.

رینو سکسینا ایک اسکول میں لیڈی ٹیچر ہیں۔ وہ اینڈریوز گنج سے واپس آتے ہوئے بس سے اتریں۔ ان کے گلے میں سونے کی زنجیر تھی۔ بیس سالہ نرائن داس جو ایک بدنام شخص ہے اس نے رینو سکسینا کا پیچھا کیا اور ان کی زنجیر کھینچ کر بھاگا۔ رینو سکسینا نے شور کیا۔ ان کے شور کو سن کر مسٹر گیان پرکاش اور مسٹر سنجے دت گپتا نے ملزم کو دوڑایا اور کچھ دور جا کر اس کو پکڑ لیا۔ مگر انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سونے کی زنجیر اس کے پاس موجود نہیں ہے۔ یہ راز اس وقت کھلا جب پولیس نے ملزم کو اپنے قبضہ میں لیا۔ وہ اس کو آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ لے گئی۔ وہاں اس کو ایکسرے مشین کے سامنے کھڑا کیا گیا۔ ایکسرے نے بتایا کہ سونے کی زنجیر اس کے پیٹ میں موجود ہے۔ ملزم نے زنجیر کو چرانے کے بعد اس کو نگل لیا تھا۔

یہ صورت حال جو دنیا میں نظر آتی ہے یہی زیادہ بڑے پیمانہ پر آخرت میں پیش آئے گی۔ موجودہ دنیا میں لوگوں کے جرائم پر ظاہری پردے پڑے ہوئے ہیں۔ مگر آخرت ان پردوں کو کھول دے گی۔ اس کے بعد وہ سب کچھ صاف دکھائی دینے لگے گا جو دنیا میں لوگوں نے طرح طرح کے پردوں میں چھپا رکھا تھا۔

آسان حل

ایک حکیم صاحب تھے۔ ایک شخص ان کے پاس آیا۔ اس کے پاس ایک ڈبہ تھا۔ اس نے ڈبہ کھول کر ایک زیور نکالا۔ اس نے کہا کہ یہ خالص سونے کا زیور ہے۔ اس کی قیمت دس ہزار روپے سے کم نہیں ہے۔ اس وقت مجھے مجبوری ہے۔ آپ اس کو رکھ کر پانچ ہزار روپے مجھے دیدیجئے۔ میں ایک ماہ میں روپیہ دے کر اسے واپس لے لوں گا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ نہیں، میں اس قسم کا کام نہیں کرتا۔ مگر آدمی نے کچھ اس انداز سے اپنی مجبوری بیان کی کہ حکیم صاحب کو ترس آگیا اور انھوں نے پانچ ہزار روپیہ دے کر زیور لے لیا۔ اس کے بعد انھوں نے زیور کو لوہے کی الماری میں بند کر کے رکھ دیا۔

مہینوں گزر گیے اور آدمی واپس نہیں آیا۔ حکیم صاحب کو تشویش ہوئی۔ آخر انھوں نے ایک روز اس زیور کو لوہے کی الماری سے نکالا اور اس کو بیچنے کے لیے بازار بھیجا۔ مگر سُنار نے جانچ کر بتایا کہ وہ پیتل کا ہے۔ حکیم صاحب کو سخت صدمہ ہوا۔ تاہم روپیہ کھونے کے بعد وہ اپنے آپ کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے اس کو بھلا دیا۔ انھوں نے صرف یہ کیا کہ جس زیور کو وہ اس سے پہلے بند الماری میں رکھے ہوئے تھے اس کو ایک کھلی الماری میں ڈال دیا۔ انھوں نے اس کو سونے کے خانہ سے نکال کر پیتل کے خانہ میں رکھ دیا۔

انسانی معاملات کے لیے بھی یہی طریقہ بہترین طریقہ ہے۔ انسانوں کے درمیان اکثر شکایت اور تلخی صرف اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ ایک آدمی سے ہم نے جو امید قائم کر رکھی تھی اس میں وہ پورا نہیں اترا۔ ہم نے ایک آدمی کو با اصول سمجھا تھا مگر تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بے اصول ہے۔ ہم نے ایک شخص کو اپنا خیر خواہ سمجھا تھا مگر وہ بدخواہ ثابت ہوا۔ ہم نے ایک شخص کو معقول سمجھ رکھا تھا مگر تجربہ کے بعد وہ غیر معقول نکلا۔

ایسے مواقع پر بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی کو اِس خانہ سے نکال کر اُس خانہ میں رکھ دیا جائے۔ جس چیز کو ہم نے سونے کی الماری میں محفوظ کر رکھا تھا اس کو اس سے نکال کر پیتل کی الماری میں ڈال دیا جائے۔

ریموٹ کنٹرول

موجودہ زمانے نے انسانی لغت میں جن نئے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک ریموٹ کنٹرول (Remote control) ہے۔ یعنی دور سے کسی ظاہری واسطہ کے بغیر کنٹرول کرنا۔

موجودہ زمانہ میں بہت سی ایسی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں جن میں سگنل یا پیغام تاروں پر نہیں بھیجا جاسکتا۔ مثلاً حرکت کرنے والی سواریاں جیسے ہوائی جہاز یا خلائی جہاز وغیرہ۔ ان حالات میں مشین کو حسب منشا چلانے کے لیے ریموٹ کنٹرول یا ریڈیو کنٹرول کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

ایسے حالات میں کوڈ کی صورت میں سگنل بھیجے جاتے ہیں۔ متعلقہ مشین میں ایک ریسیور ہوتا ہے جو مطلوبہ فریکوئنسی پر اس کو وصول کرنے کے لیے ہر آن متحرک رہتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں یہ طریقہ بہت سے کاموں میں کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے۔

ریموٹ کنٹرول کا طریقہ اب اس حد تک ترقی کر چکا ہے کہ خلا میں اپنے مدار پر گھومنے والی مشینوں کو زمین سے نہایت صحت کے ساتھ ہدایات بھیجی جاتی ہیں اور ان کی نگرانی کی جاتی ہے۔ اگر ان کے اندر کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو کسی مادی واسطہ کے بغیر محض ریڈیائی لہروں کے ذریعہ ان کو زمین ہی سے درست کر دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس ایجاد نے تخریب کاروں کو بھی جدید مواقع فراہم کر دیے ہیں۔ چنانچہ ۲۵ مئی ۱۹۸۵ کو امیر کویت کی موٹر کار کے پاس جو بم پھٹا وہ دور سے کنٹرول کیا جانے والا ایک بم (Remote-controlled bomb) تھا۔

ریموٹ کنٹرول کا یہ نظام ایک معنوی حقیقت کا مادی مظاہرہ ہے۔ یہ ایک عملی مثال کی صورت میں بتا رہا ہے کہ خدا کس طرح پھیلی ہوئی کائنات کو بلا واسطہ کنٹرول کرتا ہے اور کس طرح اس کو اپنی منشا کے مطابق چلا رہا ہے۔ ریموٹ کنٹرول ریڈیو اگرچہ ایک انسانی واقعہ ہے مگر اس نے عظیم تر خدائی واقعہ کو ہمارے لیے قابل فہم بنا دیا ہے۔

کیسا عجیب

انگریزی اخبار پیٹریاٹ (Patriot) کی ایک صحافتی ٹیم ہندستان کے مسلم مدارس کا جائزہ لینے کے لئے نکلی۔ ۸ جنوری ۱۹۸۵ کو وہ یوپی کے ایک عربی مدرسہ میں پہنچی۔ انھوں نے تفصیل کے ساتھ مدرسہ کو دیکھا۔ اس موقع پر مدرسہ کے ناظم اعلیٰ نے صحافیوں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے بالخصوص ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ ہندستان کی جنگ آزادی کے دوران ہندستانی مسلمانوں کو برطانوی حکومت سے متنفر کرانے میں دینی مدارس نے ایک اہم اور موثر کردار ادا کیا ہے (جنوری ۱۹۸۵)

یہ بات جو لکھنے والے نے مسلم مدارس کے بارہ میں لکھی ہے وہی موجودہ زمانہ کی تمام مسلم قیادت پر صادق آتی ہے۔ ہماری قیادت نے موجودہ زمانہ میں اس راز کو نہیں سمجھا کہ دوسری قومیں ہمارے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے ان قوموں کو حریف اور رقیب کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے ان کو خدا کے دین کا مدعو ہونے کی نظر سے نہیں دیکھا۔

مدعو ہونے کی حیثیت سے یہ قومیں ہماری محبت اور خیر خواہی کی مستحق تھیں مگر حریف اور رقیب سمجھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ ہمارے لئے صرف نفرت کا موضوع بن کر رہ گئیں۔

کیسی عجیب ہے وہ اگلی نسل جس کے پاس فخر کرنے کے لئے یہ ہو کہ اس کی پچھلی نسل نے ان لوگوں سے نفرت کی جن کو خدا نے ان کے لئے مدعو بنا کر ان کے پاس بھیجا تھا۔ اس کے بعد اگر ان قوموں کو مسلمانوں کے دین سے نفرت ہو جائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ جن لوگوں کے لئے ہمارے پاس نفرت کا تحفہ ہو کیا ان کے پاس ہمارے لئے محبت کا تحفہ ہوگا۔

موجودہ زمانہ کی مسلم قیادت نے بیشمار ہنگامے کھڑے کئے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو انھوں نے اپنے بعد صرف دو چیزوں کی وراثت چھوڑی ہے ــــ مسلمانوں میں جھوٹا فخر اور غیر مسلموں میں جھوٹی نفرت۔

اسلام واقعۃً جس کے سینہ کے اندر سما جائے وہ اس کے اندر تواضع پیدا کرے گا نہ کہ فخر۔ اسی طرح جس کا ذہن اسلام کے زیر اثر بنا ہو وہ یک طرفہ طور پر دوسروں کا خیر خواہ بن جائے گا۔ خواہ دوسرے لوگ اس کے ساتھ جو بھی سلوک کر رہے ہوں۔

انسان کی منزل

برازیل جنوبی امریکہ کا ایک ملک ہے جو اٹلانٹک سمندر کے کنارے واقع ہے۔ اس کی آبادی ۱۱۹ ملین ہے۔ جس میں زیادہ تر رومن کیتھولک ہیں۔ برازیل میں ۱۹۶۴ سے فوجی حکومت قائم تھی۔ فوجی حکومت کے خلاف جن جمہوریت پسند لیڈروں نے تحریک چلائی ان میں ممتاز نام ٹینکریڈو نیوس (Tancredo Neves) کا تھا۔ مسٹر نیوس نے بے شمار مصیبتیں اٹھائیں۔ ۲۱ سال کی پُرمشقت جدوجہد کے بعد بالآخر وہ ملک کے عوام کو حکومت کے خلاف منظم کرنے میں کامیاب ہوگیے۔ فوجی حکمراں مجبور ہوگئے کہ ملک میں عام انتخابات کرائیں۔

جنوری ۱۹۸۵ میں الکشن ہوا۔ اس الکشن میں مسٹر نیوس بھاری اکثریت سے صدر منتخب ہوگئے۔ اخبارات اور ریڈیو نے ان کی کامیابی کا شاندار تذکرہ کیا۔ ایک اخبار نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ان کی کامیابی ایک ایسے شخص کی کامیابی ہے جس کا سیاسی کردار ۵۰ سال کی مدت تک پھیلا ہوا ہے:

His Victory capped a political career spanning nearly fifty years.

۱۵ مارچ ۱۹۸۵ کو مسٹر نیوس کی حلف برداری کی رسم صدارتی محل میں ادا کی جانے والی تھی مگر عین اسی تاریخ کو چند گھنٹہ پہلے وہ بیمار پڑگیے۔ انھیں فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا۔ ملک کے سب سے بہتر اسپتال میں وہ ایک مہینہ تک ماہر ڈاکٹروں کی نگرانی میں رہے۔ اس مدت میں ان کا سات آپریشن کیا گیا۔ مگر ساری طبی کوششیں ناکام ہوگئیں۔ ۲۱ اپریل ۱۹۸۵ کو مسٹر نیوس کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۵ سال تھی۔

کیسا عجیب ہے انسان کا یہ انجام کہ وہ کوشش کرتا ہے مگر وہ اس کا پھل نہیں پاتا۔ اس کے لیے فتح کا تاج تیار کیا جاتا ہے مگر اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ اس کو وہ اپنے سر کی زینت بنائے۔ اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ موجودہ دنیا صرف کرنے کی جگہ ہے، وہ پانے کی جگہ نہیں۔ پانے کی جگہ اس کے سوا کوئی اور ہے۔ عقل مند انسان وہ ہے جو اس راز کو جانے اور اس کے مطابق عمل کرے۔

فطرت کی پکار

برٹرینڈرسل ایک انگریز مفکر ہے۔ وہ موجودہ زمانہ کا بہت بڑا ملحد سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کی سوانح عمری بتاتی ہے کہ انسان بظاہر خواہ کتنا ہی بڑا ملحد ہو جائے وہ اپنے آپ کو خدائی فطرت سے آزاد نہیں کر سکتا۔

برٹرینڈرسل ۱۹۵۲ میں یونان گیا۔ اس سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ یہ یونان کا میرا پہلا سفر تھا۔ اور جو کچھ میں نے دیکھا وہ میرے لیے بے حد دلچسپی کا باعث تھا۔ ایک پہلو سے تو مجھے خود تعجب ہوا۔ وہ عظیم اور ٹھوس کامیابیاں جن کو دیکھ کر ہر شخص متاثر ہوتا ہے۔ میں بھی متاثر ہوا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے چرچ میں پایا۔ یہ اس وقت کی یادگار تھا جب کہ یونان بازنطینی سلطنت کا حصہ تھا۔ مجھے سخت حیرانی ہوئی جب میں نے دیکھا کہ اس سے میں نے اپنے آپ کو اس سے زیادہ مانوس پایا جتنا کہ میں یونان کی قبل مسیح دور کی یادگاروں سے متاثر ہوا تھا۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ مسیحی نقطہ نظر میرے اوپر اس سے زیادہ غالب ہے جتنا کہ میں نے سمجھا تھا۔ یہ غلبہ میرے عقائد پر نہیں تھا بلکہ میرے احساسات پر تھا:

To my astonishment, I felt more at home in this little church than I did in the Parthenon or in any of the other Greek buildings of Pagan times. I realised then that the Christian outlook had a firmer hold upon me than I had imagined. The hold was not upon my belief, but upon my feelings. (p. 561)

یہ الفاظ اس شخص کے ہیں جس کی ملحدانہ کتابوں میں سے ایک کتاب وہ ہے جس کا نام ہے: میں عیسائی کیوں نہیں (Why I Am Not A Christian) حقیقت یہ ہے کہ برٹرینڈرسل کے یہ الفاظ اس کی فطرت کی پکار ہیں۔ ہر انسان کی فطرت میں خدا اور مذہب کا شعور ابدی طور پر پیوست ہے، وہ چاہے بھی تو اس کو اپنے اندر سے نکال نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ملحد اور منکر بھی اندر سے اپنے الحاد و انکار پر غیر مطمئن رہتے ہیں، وہ خاص لمحات میں بے تابانہ طور پر اسی چیز کی طرف دوڑ پڑتے ہیں جس کا بظاہر وہ اپنی زبان سے انکار کر رہے تھے۔

قریب مگر دور

ایرانڈیا کا ایک جہاز (بوئنگ ۷۴۷) ۲۲ جون ۱۹۸۵ کو مانٹریل سے اڑا۔ اس پر جہاز کے عملہ سمیت ۳۲۹ آدمی سوار تھے۔ وہ مانٹریل سے لندن ہوتا ہوا دہلی آنے والا تھا۔ دہلی کے پالم ایرپورٹ پر حسب معمول بہت سے لوگ اپنے آنے والے عزیزوں اور مہمانوں کا انتظار کر رہے تھے۔ آنے والے مسافروں میں کچھ وہ لوگ تھے جو کمائی کر کے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ کچھ وہ لڑکے اور لڑکیاں تھیں جو ہندستان میں شادی کرنے کے لیے آ رہی تھیں۔ کچھ لوگ اپنے متعلقین سے ملنے کے لیے اپنے وطن پہونچنے والے تھے۔

اچانک خوشیاں غم میں تبدیل ہو گئیں۔ معلوم ہوا کہ جہاز اٹلانٹک کے اوپر پرواز کر رہا تھا کہ آئرلینڈ کے قریب اس کو حادثہ پیش آگیا اور وہ برباد ہو کر سمندر میں گر پڑا۔ ہوائی اڈہ پر مرنے والے مسافروں کی فہرست آویزاں کر دی گئی۔ تمام لوگ جو ہوائی اڈہ پر انتظار کر رہے تھے وہ فہرست دیکھنے کے لیے متعلقہ بورڈ کی طرف دوڑے۔ اس موقع پر ایک انگریزی اخبار کے رپورٹر نے اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں:

In their moment of stunned disbelief, each one thought "this could not be happening to me." But, with merciless equality the death list shattered all their hopes.

ہوش اڑا دینے والی بے یقینی کے اس لمحہ میں ہر ایک یہ سوچ رہا تھا کہ ایسا حادثہ میرے ساتھ پیش نہیں آسکتا۔ مگر بے رحم مساوات کے ساتھ موت کی فہرست نے ان کی تمام امیدوں کو بکھیر دیا۔ (ہندستان ٹائمس ۲۴ جون ۱۹۸۵) فہرست نے بتایا کہ ہوائی جہاز کے ۳۲۹ مسافر سب کے سب اچانک حادثہ کا شکار ہو کر ختم ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں جو اپنے انتظار کرنے والوں تک پہنچنے والا ہو۔

ہر روز اس دنیا میں بے شمار آدمی مر رہے ہیں۔ یہ واقعہ لوگوں کو ہلا دینے کے لیے کافی ہے۔ مگر آدمی کا حال یہ ہے کہ جب وہ کسی کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ موت صرف دوسروں کے لیے ہے، اس کے اپنے لیے موت نہیں۔ اپنے کو الگ کرنے کی اس نفسیات کا یہ نتیجہ ہے کہ آدمی سبق نہیں لیتا۔ وہ موت کے عین قریب ہو کر بھی موت کے پیغام کو نہیں سنتا۔

سب سے بڑا فریب

ایک نوجوان نے سی اے کا کورس کیا۔ اس کے بعد انہوں نے امریکہ سے ایم بی اے کی ڈگری لی۔ دونوں امتحانوں میں وہ فرسٹ آئے۔ اس کے بعد ان کے لیے ترقیات کے دروازے کھل گئے۔ وہ عرب امارات گئے۔ وہاں ان کو پانچ ہزار درھم ماہوار کی ملازمت مل گئی۔ جلد ہی بعد انہیں ایک سعودی وفد نے انٹرویو کے لیے بلایا۔ انٹرویو کامیاب رہا۔ فوراً ہی ان کو سعودی عرب میں ایک جگہ مل گئی جہاں ان کی تنخواہ ۱۵ ہزار ریال ماہوار تھی۔ وہ اسی طرح ترقی کرتے رہے یہاں تک کہ ان کی آمدنی ہندستانی سکہ میں ایک لاکھ روپیہ ماہوار تک پہنچ گئی۔

ترقی کے یہ مواقع جو موجودہ زمانہ میں کھلے ہیں وہ وقت کا سب سے بڑا فتنہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی جھوٹی بنیادوں پر اپنے کو "فرسٹ کلاس" سمجھتا ہے۔ حالاں کہ حقیقت کے اعتبار سے وہ "تھرڈ کلاس" ہوتا ہے۔ وہ جھوٹی بنیادوں پر اپنے کو کامیاب سمجھتا ہے، حالاں کہ وہ کامیابی کی منزل سے بہت دور ہوتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے ان امکانات نے بہت سے لوگوں کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایسے ماحول میں پائیں جہاں ان کے رہنے کے لیے سجے ہوئے مکانات ہوں۔ سفر کے لیے شاندار گاڑیاں ہوں۔ بینک بیلنس ہو۔ ان کی جیب میں کریڈٹ کارڈ ہو جس کے ذریعے وہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں اپنے لیے حسب منشار رقم حاصل کر سکیں۔

یہ چیزیں جدید انسان کے لیے زبردست فتنہ بن گئی ہیں۔ ہر آدمی اپنے آپ کو مادیت کے وقتی بازار میں فروخت کر رہا ہے۔ ہر آدمی کامیابی کے جھوٹے فریب میں مبتلا ہے۔ ہر آدمی فرضی خوش خیالیوں کا ایک محل اپنے گرد بنائے ہوئے ہے۔

مگر حقیقت کے اعتبار سے ان چیزوں کی کوئی قیمت نہیں۔ امریکی وفاداری کا تمغہ روس میں بے قیمت ہوتا ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا کی مہارتیں آخرت میں بالکل بے وزن قرار پائیں گی —— آہ وہ انسان جو جھوٹے فریب میں جی رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ سمجھتا ہے کہ وہ حقیقت کے پہاڑ پر اپنا محفوظ قلعہ بنائے ہوئے ہے۔

انسان کی بے چارگی

بنگلہ دیش بے شمار چھوٹے چھوٹے جزائر کا مجموعہ ہے۔ یہاں اکثر شدید سمندری طوفان آتے ہیں اور انسانی آبادیوں کو غیر معمولی نقصان پہنچاتے ہیں۔ اب تک کے ریکارڈ کے مطابق ۱۸۷۶ء میں یہاں سخت ترین طوفان آیا جس میں تقریباً تین لاکھ انسانی جانیں ضائع ہوگئیں۔ دیگر نقصانات اس کے علاوہ ہیں۔

مئی ۱۹۸۵ میں یہاں پھر طوفان آیا۔ طوفانی ہوائیں ۱۵۰ کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے تقریباً ایک ہزار جزیروں کے علاقہ میں داخل ہوگئیں۔ دوسری طرف سمندر کی چار میٹر سے بھی زیادہ اونچی لہروں نے جزائر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تقریباً ایک لاکھ انسان اس کے آگے بے بس ہو کر ہلاک ہو گئے۔ سیکڑوں بستیاں تنکوں کی طرح طوفانی لہروں میں بہہ گئیں۔ ایک اخبار کے رپورٹر نے اپنا عینی مشاہدہ ان الفاظ میں بیان کیا:

> Urir Char ... looks like it has been bombed relentlessly. Not a single structure, save the concrete forest office stands erect. In fact so fierce has been the force of the gale and tidal waves that not only the houses. but even the building materials were washed away, leaving behind just mounds.

ایک انگریزی اخبار (۲۹ مئی ۱۹۸۵) نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ــــــ مہلک طوفان جو قدرت کے غصہ کے سامنے انسان کی بے چارگی کو بے نقاب کرتا ہے:

> — murderous cyclones which expose man's helplessness before nature's fury.

حادثات انسان کو حقیقتِ واقعہ کی یاد دلاتے ہیں۔ وہ خدا کی قدرت اور انسان کے عجز کا واقعاتی اعلان ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ خدا کل کے دن انسان کو پکڑے گا جس طرح آج اس نے انسان کو پکڑا ہے ــــــ موجودہ عارضی دنیا میں انسان اپنے عجز کو بھگتتا ہے۔ کیسا عجیب ہوگا انسان کا حال اگر وہ آخرت کی ابدی دنیا میں اپنے گناہ کو بھگتے۔

عجیب لوگ

ایران حضرت عمر فاروق کے زمانۂ خلافت میں فتح ہوا ہے۔ اس وقت ایران کی مسلم افواج کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص تھے۔ اس جنگ میں ایرانیوں کا کافی نقصان ہوا۔ چنانچہ انہوں نے گفت و شنید کی پیش کش کی۔ حضرت سعد نے مختلف وفود کو رستم اور یزدگرد کے دربار میں بھیجا۔ مثلاً نعمان بن مُقرن۔ فرات بن حیان۔ حنظلہ بن ربیع۔ عُطارد بن حاجب۔ اشعث بن قیس۔ مغیرہ بن شعبہ۔ عمرو بن معدیکرب کے وفود (البدایہ والنہایہ)

تاریخ میں ان سفارتوں کی کافی تفصیلات آئی ہیں۔ آخری مرحلہ میں حضرت مغیرہ کا وفد شہنشاہ یزدگرد کے زرق برق دربار میں آیا۔ مدائن کے محل میں انھوں نے انتہائی بے خوفی کے ساتھ تقریر کی۔ یزدگرد اس کو سن کر بگڑ گیا۔ اس نے کہا کہ تم میرے سامنے اس طرح کی باتیں کرتے ہو۔ اگر یہ قاعدہ نہ ہوتا کہ ایلچی قتل نہ کئے جائیں تو میں تم کو ضرور قتل کر دیتا۔ اب تم واپس جاکر اپنے امیر کو بتا دو کہ میں سپہ سالار رستم کی سرکردگی میں ایسا لشکر بھیجنے والا ہوں جو تم سب کو قادسیہ کے خندق میں دفن کر دے گا۔

پھر یزدگرد نے محل کے آدمیوں سے کہا کہ ایک ٹوکری میں مٹی بھر کر لاؤ۔ مٹی لائی گئی تو اس نے مسلمانوں کے وفد سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ تم میں سب سے زیادہ شریف کون ہے۔ وفد کے افراد چپ رہے۔ اس کے بعد عاصم بن عمرو بولے کہ میں سب سے زیادہ شریف ہوں۔ یزدگرد نے حکم دیا کہ مٹی کی ٹوکری عاصم بن عمرو کے گلے میں لٹکائی جائے اور ان کو یہاں سے بھگا دیا جائے یہاں تک کہ وہ مدائن کے باہر چلے جائیں۔

شاہی حکم کے مطابق مٹی کی ٹوکری عاصم بن عمرو کے گلے میں لٹکا دی گئی۔ وہ اس کو لے کر مدائن کے محل سے نکلے اور اونٹنی پر سوار ہو کر تیزی سے قادسیہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں حضرت سعد بن ابی وقاص مقیم تھے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے حضرت سعد کو ساری روداد سنائی اور مٹی کی ٹوکری ان کے سامنے رکھ دی۔ اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ تاریخ کے الفاظ میں یہ ہے:

ابشروا فقد واللہ اعطانا اللہ اقتالید ملکھم و تفاءلوا بذالک اخذ بلادھم

خوش ہوجاؤ۔ کیونکہ خدا کی قسم اللہ نے ہمیں ان کے اقتدار کی کنجیاں دیدی ہیں۔ اور انھوں نے اس سے ان کے ملک پر قبضہ کی فال لی۔

یہ مسلمان اگر مٹی پاکر غصہ ہوتے تو ان کے حصہ میں نفرت اور شکایت کے سوا کچھ نہ آتا۔ مگر جب وہ غصہ نہیں ہوئے تو مٹی دینے کا واقعہ ان کے لئے ملک دینے کے ہم معنیٰ بن گیا۔ ایک انتہائی ناخوشگوار واقعہ سے بھی انھوں نے اپنے لئے یقین اور حوصلہ کی غذا حاصل کرلی۔

یہی موجودہ دنیا میں ترقی اور کامیابی کا راز ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر شخص اور ہر گروہ کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ اس آزادی نے موجودہ دنیا کو مقابلہ (Competition) کی دنیا بنا دیا ہے۔ یہاں ہر آدمی دوسرے آدمی کی کاٹ میں ہے۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کو دھکیل کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔

ایسی حالت میں ایک صورت یہ ہے کہ آدمی غصہ اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو۔ وہ انتقامی نفسیات میں جلتا رہے۔ ایسے آدمی کا ذہن ہمیشہ منتشر رہے گا۔ وہ کبھی گہری منصوبہ بندی نہ کرسکے گا۔ ایسے آدمی کے لئے موجودہ دنیا میں ناکامی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچائے۔ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہو۔ ایسے آدمی کا ذہن ہمیشہ اعتدال کی حالت میں رہے گا۔ وہ اپنے منفی اور مثبت پہلوؤں کو کسی کمی بیشی کے بغیر جان لے گا۔ اس کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ وہ تمام حقیقتوں کو نگاہ میں رکھے اور حالات کے عین مطابق منصوبہ بندی کرے۔ ایسے شخص کے لئے کامیابی اتنی ہی یقینی ہے جتنا رات کے بعد سورج کا نکلنا۔

جو شخص اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچائے اس کی سوچ نہایت اعلیٰ سوچ بن جاتی ہے۔ اس کی نظر ہمیشہ امکانات پر ہوتی ہے۔ وہ مٹی کی ٹوکری میں پورے ملک کی تصویر دیکھ لیتا ہے۔ حوصلہ شکنی کے واقعات اس کے ذہنی خانہ میں داخل ہوکر حوصلہ مندی کے واقعات بن جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو شکست کو فتح میں تبدیل کرتے ہیں۔ وہ ناکامی میں کامیابی کا راز دریافت کرلیتے ہیں۔

توہم پرستی

انسانی زبانیں ہزاروں سال تک توہمات (Superstitions) کا شکار رہی ہیں۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ بعض زبانیں خدائی اصل (Divine Origin) رکھتی ہیں اور ان کے بولنے والوں کو دوسری زبانوں پر خصوصی درجہ حاصل ہے۔ مثلاً یونانی زبان کے متعلق عرصہ تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ وہ تمام دوسری زبانوں سے اعلیٰ ہے۔ وہ دیوتاؤں کی زبان ہے۔ دوسری زبانیں اس کے مقابلہ میں وحشیوں کی زبانیں ہیں۔

یہی معاملہ عبرانی کا ہوا۔ یہودی۔ مسیحی دنیا میں صدیوں تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ عبرانی زبان خدا کی اپنی زبان ہے۔ وہ سب سے پہلے دنیا میں بولی گئی۔ ونڈرلی اور نیڈا زبانوں پر مسیحی عقائد کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جن عوامل نے لسانی ترقی کو روکا ان میں سے ایک قدیم مسیحی مولفین کا یہ عقیدہ تھا جو نشاۃ ثانیہ کے دور میں شدت سے چھایا رہا کہ تمام زبانیں عبرانی سے نکلی ہیں:

> One of the factors which retarded linguistic progress was the belief among early Christian writers and persisting well into the Renaissance era, that all languages were derived from Hebrew.
>
> William L. Wonderly and Eugene Nida in
> "*Linguistics and Christian Missions*"
> *Anthropological Linguistics*, Vol. 5, pp. 104–144

چنانچہ صدیوں تک علماء لسان لاحاصل کوششوں میں مشغول رہے۔ وہ ہر زبان کا رشتہ عبرانی سے ثابت کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم اللسان ترقی نہ کر سکا۔ اٹھارہویں صدی میں جب یہ فکر مغلوب ہوا اس وقت یورپ کی مختلف زبانوں کا علم اللسان ترقی کرنا شروع ہوا۔

خدائی زبان (Divine Language) کا تصور تمام تر توہمات کی پیداوار ہے۔ یہ صورت جو زبان کے ساتھ پیش آئی یہی قدیم زمانہ میں دوسرے انسانی شعبوں کا بھی حال تھا۔ بے شمار قسم کے توہماتی عقائد تھے جنھوں نے انسانی ترقی کو روک رکھا تھا۔ تاریخ میں پہلی بار جس نے اس بند کو توڑا وہ توحید کا انقلاب تھا جو پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھیوں کے ذریعہ رونما ہوا۔ یہ انقلاب اولاً عرب میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد اس کے اثرات ساری دنیا میں پہونچے۔ انسانی تاریخ توہم پرستی کے دور سے نکل کر حقیقت پسندی کے دور میں داخل ہو گئی۔

حکمت

حضرت علی کی نصیحتوں میں سے ایک نصیحت یہ ہے:

کلموا الناس علی قدر عقولھم اتریدون لوگوں سے ان کی فہم کے مطابق بات کرو۔ کیا تم چاہتے ان یکذب اللہ ورسولہ ہو کہ اللہ اور رسول کو جھٹلایا جائے۔

بعض باتیں بذات خود صحیح ہوتی ہیں۔ مگر ان کی گرفت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو گہری سمجھ رکھتے ہوں عام لوگ ان کو پکڑ نہیں سکتے۔ ایسی حالت میں بات کرتے ہوئے مخاطب کے معیار فہم کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ سادہ فہم کے لوگوں سے زیادہ گہری قسم کی باتیں کی جائیں تو اندیشہ ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے وہ اس سے متوحش ہو جائیں۔

ایک مرتبہ میں چند آدمیوں کے ساتھ تھا۔ ایک گفتگو کے دوران میری زبان سے یہ فقرہ نکلا:

"خود کفیل زندگی تمام نیکیوں کا آغاز ہے۔"

یہ سن کر ہمارے ساتھی متوحش ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کیا بات آپ نے کہہ دی۔ ہم تو یہ سمجھتے رہے ہیں کہ ایمان سے نیکیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ اور آپ فرما رہے ہیں کہ خود کفیل زندگی تمام نیکیوں کا آغاز ہے۔

میں ابھی خاموش تھا کہ میرے ایک اور ساتھی نے بات سنبھال لی۔ انھوں نے کہا کہ بھائی یہ حکمت کا کلمہ ہے۔ اس کو قانون کی نظر سے نہ دیکھو بلکہ حکمت کی نظر سے دیکھو۔

ادبی انقلاب

نیوٹن (۱۷۲۷ - ۱۶۴۲) کی دریافتوں کے نتیجہ میں جو عظیم ذہنی انقلاب ہوا، اس کے بعد یورپ میں ایک ترقی یافتہ تکنیک وجود میں آئی اور پھر مطالعہ کے قطعی طریقے (Exact methods) پیدا ہوئے جن کو مسائل پر منطبق کیا جانے لگا۔ اس نہج نے فلسفہ، الٰہیات اور سیاسیات کے طریق مطالعہ کو متاثر کیا۔ اس باب میں ہم ادب پر اس انقلاب کے اثرات کا مطالعہ کریں گے۔

سائنسی علم (Scientific knowledge) سے پیدا شدہ صورت حال نے لکھنے والوں پر قابل لحاظ اثر ڈالا ہے۔ شکسپیر (۱۶۱۶ - ۱۵۶۴) جو کچھ پورے اعتماد اور سنجیدگی کے ساتھ لکھ سکتا تھا، وہ ملٹن (۱۶۷۴ - ۱۶۰۸) کے لئے ناممکن اور الگزینڈر پوپ (۱۷۴۴ - ۱۶۸۸) کے لئے ناقابل قیاس تھا، اگرچہ ادبی صلاحیتوں (Literary talents) کے اعتبار سے تینوں یکساں بلندی کے انسان تھے۔ شکسپیر کو تینوں میں سب سے اونچا مقام حاصل ہوا۔ اس کی کم از کم جزئی وجہ یہ تھی کہ اسے ایک خوش قسمت عہد (Fortunate period) ملا۔ وہ انگریزی زبان کے ایک عظیم دور کے آغاز میں اور عظیم ذہنی انقلاب سے پہلے پیدا ہوا۔ جس زمانہ میں اس نے اپنی تحریریں لکھیں، اس وقت استعاراتی انداز اہمیت رکھتا تھا جو نیوٹن کے بعد اسے پھر حاصل نہ ہو سکا۔

تمثیل موجودہ زمانہ میں دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایک تمثیل وہ ہے جو سائنس داں کے لئے عملی نمونہ (Working model) کا کام دیتی ہے۔ ایٹم کا قدیم تصور کہ وہ بالکل گول ہے، انتہائی سخت ہے۔ اسی قسم کا ایک ماڈل تھا۔ بعد کو ردرفورڈ (۱۹۳۷ - ۱۸۷۱) کا ایٹمی تصور بھی اس کی ایک مثال تھا جس کے مطابق اس کے اندر ایک ایٹمی نیوکلیس تھا جو مثبت برقی چارج رکھتا تھا اور اس کے گرد الکٹرون (Electron) سیاروں کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ تمثیل کی یہ قسم تجربات سے حاصل شدہ علم کے خلاصہ کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اگر اندازے پورے اتریں تو ماڈل باقی رہتا ہے۔ اور اگر اندازے پورے نہ ہوں تو ماڈل کی یا تو تصحیح کی جاتی ہے یا اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔

ادبی کنایہ (Literary analogy) جو عام طور پر تشبیہ کی شکل میں ہوتا ہے، اس کا مقصد بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہ اس لئے وضع کیا جاتا ہے کہ قاری کو ایک بیان کی صداقت کے بارہ میں

ایک دلچسپ نظیر سے متاثر کیا جائے۔ سائنسی ماڈل کے مقابلہ میں یہ بالکل وقتی نوعیت کی چیز ہے۔ سائنسی ماڈل سائنس داں کے اندازوں کو ظاہر کرنے کے لئے اس وقت تک استعمال کیا جاتا ہے، جب تک وہ غلط ثابت نہ ہو جائے۔ مزید یہ کہ ادبی تمثیل اپنی ذات میں کوئی ایک چیز نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ حقیقی نہیں سمجھی جاتی۔

تاہم عظیم ذہنی انقلاب سے پہلے یہ دو قسم کی تمثیلات ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ نہیں تھیں۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ اخلاقی نظام ہر اعتبار سے نہایت گہرائی کے ساتھ طبیعی دنیا سے مربوط ہے۔ جب شکسپیر اپنے ایک ڈرامہ کے کردار کی زبان سے فوجی نظم وضبط پر استدلال کرتے ہوئے اس سے کہتا ہے کہ سورج سیاروں کے درمیان کمانڈر کی سی پوزیشن رکھتا ہے تو وہ محض ایک تشبیہ نہیں دیتا بلکہ اپنے یقین کے مطابق وہ کائنات کی فطرت کے بارہ میں ایک صحیح سائنسی بیان دیتا ہے۔ یہ خدائی نظام کا ایک جزء تھا کہ سورج سیاروں کے اوپر حکمراں ہو اور اسی طرح Agamemnon یونانیوں کے اوپر حکومت کرے۔ اور ان دونوں میں سے کسی کی حکمرانی میں بھی فرق آنا وسیع تر کائنات میں خلل پیدا کرنے کا سبب بن سکتا تھا:

> The rise of science led to a separation of reason from emotion; and naturally enough, an age of prose followed an age of poetry.
> (p.108)

سائنس کے عروج نے عقل اور جذبات کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ اور فطری طور پر شاعری کے دور کی جگہ نثر کے دور نے لے لی۔

سترھویں صدی کے وسط سے پہلے نثر بھی رنگین اور شاعرانہ طرز کی ہوتی تھی۔ سولیفٹ (۱۷۴۵-۱۶۶۷) اور اڈیسن (۱۷۱۹-۱۶۷۲) کے وقت سے یہ محض سخن سازی سمجھی جانے لگی۔ ماقبل سائنس کے استعاراتی انداز کی ایک مثال لائلی (۱۶۰۶-۱۵۵۴) کی کتاب (Euphues) میں ملتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۵۷۹ میں شائع ہوئی۔ اس وقت وہ ایک پسندیدہ کتاب تھی اپنے اسٹائل کے اعتبار سے بھی اور اخلاقی مضامین کے اعتبار سے بھی۔ ۱۶۳۶ تک وہ بار بار چھپتی رہی۔ اس کے بعد عام قارئین میں اس نے اپنی جاذبیت کھو دی اور محض ایک ادبی عجوبہ (Literary curiosity) بن کر رہ گئی۔

۱۶۵۰ تک ایک شخص انگلش لٹریچر میں عالم خیال اور عالم فطرت کے درمیان کالیت (Wholeness)

پاتا ہے۔ اس صدی کے وسط سے دونوں کے درمیان خلیج پیدا ہونا شروع ہوئی اور آرٹ اور سائنس کی تقسیم کی شکل میں دونوں الگ الگ ہوگئے۔ اس کے بعد انگریزی میں ایک سادہ اور استعارہ اور کنایہ سے خالی انداز پیدا ہونے لگا جس کی سب سے بڑی وجہ یورپ میں سائنس کی طرف بڑھتا ہوا رجحان تھا۔ سادگی اظہار (Simplicity of expression) پیدا ہونے کی اور بھی وجہیں تھیں۔ مثلاً سترہویں صدی میں جب تعلیم بڑھی تو یونانی اور لاطینی کلاسیکل کتابوں کے مقابلہ میں لوگ زیادہ تر فلکیات بحریات، جہاز سازی اور گھڑی سازی کے مطالعہ میں دلچسپی لینے لگے۔ اس طرح فطری طور پر سادہ زبان کا رجحان بڑھا کیونکہ یہ مضامین شاعرانہ طرز کے ادب میں بیان نہیں کئے جاسکتے تھے۔ پچھلے سو برس میں اپنا کی زبان بھی اس سے اثر پذیر ہوئی ہے۔ تعلیمی انفجار (Literary explosion) کے بعد عوامی صحافت (Popular journalism) پیدا ہوئی اور اسٹائل میں سادگی آتی چلی گئی۔ سترھویں صدی کے بعد پیدا ہونے والے ادب کو ٹھیک ٹھیک حقائق (Precise facts) بیان کرنے تھے۔ اس لئے سادہ انداز بیان کا پیدا ہونا بالکل فطری تھا۔

سپراٹ (Spart) نے ۱۶۶۷ میں (*History of Royal Society*) لکھی۔ اور اس میں نثر کے اسٹائل کے اصول مقرر کئے۔ اس میں اس نے لکھا کہ ہم کو فطری طرز کلام (Natural way of speaking) اختیار کرنا چاہئے جس میں ریاضیاتی ڈھنگ کی واقعیت ہو اور لفظی رنگینیوں سے خالی ہو۔

۱۶۶۴ میں رائل سوسائٹی نے بالقصد ایک کمیٹی قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی زبان کے اسٹائل میں اصلاح کی کوشش کرے۔

اس وقت کے یورپ میں عوامی لہر پوری طرح شعر، استعارہ اور شاعرانہ نثر (Poetic prose) کے خلاف تھی۔ فلاسفہ عام طور پر اس طرز بیان کو سچائی (Truth) میں ایک رکاوٹ سمجھتے تھے۔ ہابس (۱۵۸۸-۱۶۷۹) کے نزدیک وہ سیدھے فکر (Straight thinking) میں خلل پیدا کرنے والا تھا روسو (۱۷۱۲-۱۷۷۸) نے کہا تھا کہ ڈیکارٹ (۱۵۹۶-۱۶۵۰) کے فلسفہ نے شاعری کو قتل کر دیا ہے۔ جان لاک (۱۶۳۲-۱۷۰۴) نے صاف طور پر کہا کہ شاعری خوبصورت تصویروں کا مجموعہ ہے مگر وہ بنیادی طور پر گمراہ کن ہے۔

ملٹن آخری شاعر تھا جو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور سر ٹامس براؤن (۱۶۸۲-۱۶۰۶) شاید آخری شخص تھا جس نے اس طرز کی نثر لکھی۔ ٹامس براؤن ایک تعلیم یافتہ شخص تھا۔ مگر وہ قدیم طرز کی زبان استعمال کرتا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ خواہش کے باوجود رائل سوسائٹی کا فیلو نہ بنایا جا سکا۔ اس وقت کے اہل فکر ایک ایسی نثر وجود میں لانا چاہتے تھے جو فلسفۂ فطرت کے نئے میکانکی تصور سے ہم آہنگ ہو۔

They were interested in the development of prose style in accordance with new mechanical concepts of natural philosophy. (p.117)

نثر میں سادگی پیدا کرنے کی تحریک کا سہرا خاص طور پر جان ڈرائڈن (۱۷۰۰-۱۶۳۱) کے سر ہے اس نے مسلسل اس کی تبلیغ کی اور خود سادہ نثر استعمال کی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جدید انگریزی درحقیقت ڈرائڈن کی زبان ہے۔

اٹھارویں صدی کو "ایج آف ریزن" کہا جاتا ہے۔ نیوٹن کے بعد محسوس کیا گیا کہ جس طرح عالم افلاک میں نظم و ضبط ہے اسی طرح لٹریچر کو بھی نظم و ضبط کا پابند ہونا چاہیے۔ اڈمنڈ والر (۱۶۸۷-۱۶۰۶) اور ڈرائڈن نے شاعرانہ زبان کے ذریعہ تاثیر پیدا کرنے کے بجائے یہ کوشش کی کہ متوازن خیالات (Well-balanced thoughts) کو معتدل اور مناسب زبان میں ادا کر کے یہ فائدہ حاصل کیا جائے۔

اڈیسن (۱۷۱۹-۱۶۷۲) نے اپنی کتاب (The Spectator) میں انھیں خیالات کی وکالت کی۔

اس ادبی تحریک (Literary move) نے ارسطو کو دوبارہ اہمیت کا مقام دے دیا۔ پوپ نے فطرت (Nature) کی پیروی کی تلقین کی۔ ورڈسورتھ کی فطرت کی نہیں بلکہ وہ فطرت جس کو نیوٹن نے دریافت کیا تھا۔

ولیم بلیک (۱۸۲۷-۱۷۵۷) نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ وہ شاعر کو اسی قسم کی ایک مخلوق سمجھتا تھا جیسے قدیم اسرائیلی پیغمبر۔ اسی طرح ورڈسورتھ (۱۸۵۰-۱۷۷۰) نے بھی اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس نے کہا کہ حقیقت کی کچھ اور قسمیں ہیں جو ان مادی صداقتوں کے علاوہ ہیں

جن کو سائنس داں بیان کرتے ہیں۔ یہ دوسری قسم کی صداقتیں وہ ہیں جن تک صرف شاعر کی پہنچ ہوسکتی ہے۔

رومانوی تحریک (Romantic Movement) ایک معنی میں نیوٹنی قطعیت (Newtonian certainty) کے خلاف شاعرانہ ردعمل تھی اور ہابس کے خلاف جس نے کہا تھا کہ انسان بنیادی طور پر ایک مشین ہے۔

رومانیت (Romanticism) ایک قسم کی فراریت (Escapism) تھی۔ رومانیت شاعری کے اندر ۱۷۹۸ سے جنگ عظیم ۱۸-۱۹۱۴ تک رہی۔

اب یورپ میں تین سو سالہ دور کا ردعمل ہو رہا ہے۔ صنعتی دور کی خشکی سے اکتا کر وہ سائنس کے ساتھ آرٹ کی اہمیت کو بھی تسلیم کر رہا ہے۔ سترھویں صدی میں سائنس نے زبردست ترقی کی تھی۔ آرٹ نے بھی قدیم زمانہ میں بہت بلند مقام حاصل کیا تھا۔ ہوسکتا ہے مستقبل میں وہ دوبارہ اپنے مقام پر لوٹ آئے۔ (۱۲۵)

(دی گریٹ انٹلکچول ریلوشن کے ایک باب استعارہ کی موت (The Death of Metaphor) کا ترجمہ)

الفاظ کا رجسٹر

قدیم مدینہ میں یہود کے بعض قبیلے آباد تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے بارہ سال بعد ہجرت کرکے مدینہ آئے تو یہود بھی آپ کی مجلسوں میں آکر بیٹھنے لگے۔ قاعدہ ہے کہ سامعین میں سے کوئی شخص بات کو پوری طرح سمجھ نہ پائے تو وہ صاحب مجلس کو مزید متوجہ کرنے کے لیے کوئی لفظ بولتا ہے۔ یہود نے ایسے موقع پر رَاعِنَا کہنا شروع کیا۔

رَاعِنَا مراعات سے امر کا صیغہ ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں "ہماری رعایت کیجیے"۔ مخاطب یہ لفظ بول کر متکلم پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے متکلم کی بات کو اچھی طرح نہیں سنا یا اچھی طرح نہیں سمجھا۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ متکلم اپنی بات کی دوبارہ وضاحت کرے۔

بعض الفاظ لغت کے اعتبار سے بظاہر درست ہوتے ہیں مگر استعمال کے اعتبار سے ان میں ناپسندیدہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ رَاعِنَا کا تھا۔ رَاعِنَا لغت کے اعتبار سے بظاہر ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہود کے یہاں یہ لفظ استعمال کے اعتبار سے برے معنی کا حامل بن گیا تھا (کان هذا اللفظ سبّاً قبیحاً بلغة الیهود --- قیل کان معناه یا احمق من الرعونة، التفسیر المظهری، جلد اوّل، صفحہ ۱۱)

مدینہ کے مسلمانوں (انصار) پر سیکڑوں سال سے یہود کی دینی عظمت بیٹھی ہوئی تھی انھوں نے یہود کے عمل کو دیکھ کر سمجھا کہ شاید یہ بزرگوں اور پیغمبروں کو مخاطب کرنے کا طریقہ ہے۔ چنانچہ وہ بھی آپ کی مجلسوں میں رَاعِنَا کا لفظ استعمال کرنے لگے۔ مگر قرآن میں مسلمانوں کو اس کے استعمال سے روک دیا گیا۔ حکم ہوا کہ تم لوگ ایسے مواقع پر اُنْظُرْنَا

(ہمارے اوپر نظر کیجیے) کا لفظ بولا کرو، اور رَاعِنَا کا لفظ بولنا چھوڑ دو (البقرہ ۱۰۴)

ایک حدیث

سورہ النور (آیت ۲۷) میں یہ حکم ہے کہ اے ایمان والو، جب تم اپنے گھر کے سوا دوسروں کے گھروں میں داخل ہو تو السلام علیکم کہو اور اجازت لے کر داخل ہو۔ ابتداءً جب یہ حکم اترا تو اس کے آداب لوگوں کو صحیح طور پر معلوم نہ تھے۔ چنانچہ بعض عجیب واقعات پیش آئے۔ اس سلسلے میں ایک روایت ابوداؤد میں اس طرح آئی ہے:

عن ربعی قال اتی رجل من بنی عامر فاستاذن علی رسول الله صلی الله علیه وسلم وهو فی بیته فقال أألج فقال النبی صلی الله علیه وسلم لخادمه: اخرج الی هذا فعلّمه الاستئذان فقل له: قل السلام علیکم أأدخل فسمعه الرجل فقال السلام علیکم أأدخل۔ فاذن له النبی صلی الله علیه وسلم فدخل
(تفسیر ابن کثیر، جزء ثالث، صفحہ ۲۸۰)

حضرت ربعی کہتے ہیں کہ قبیلہ بنی عامر کا ایک شخص آیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں تھے۔ اس نے آپ سے اندر آنے کی اجازت چاہی اور کہا کہ کیا میں گھس آوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خادم سے کہا کہ اس شخص کے پاس جاؤ اور اس کو بتاؤ کہ اجازت لینے کا طریقہ کیا ہے۔ اس سے کہو کہ تمہیں یوں کہنا چاہیے کہ السلام علیکم کیا میں اندر آجاؤں۔ آدمی نے آپ کا یہ کلام سن لیا۔ اس نے دوبارہ کہا کہ السلام علیکم کیا میں اندر آجاؤں۔ اس کے بعد آپ نے اس کو اجازت دے دی اور وہ اندر داخل ہوا۔

عربی زبان میں وَلَجَ یَلِجُ کے معنی بھی اصلاً وہی ہیں جو دَخَلَ یَدْخُلُ کے معنی ہیں۔ مگر استعمال کے اعتبار سے وَلَجَ یَلِجُ کا مفہوم تقریباً وہ بن گیا ہے جس کو اردو زبان میں گھسنا کہتے ہیں۔ اس کے برعکس دَخَلَ یَدْخُلُ سادہ طور پر اندر آنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

مذکورہ شخص کا بولا ہوا لفظ لغوی زبان کے اعتبار سے درست تھا۔ مگر وہ استعمالی زبان کے اعتبار سے درست نہ تھا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس

کی اصلاح فرمائی۔

کسی تحریر یا تقریر میں الفاظ کی **موزونیت** (Appropriateness) بے حد اہم چیز ہے۔ ہر تقریر یا تحریر کا کوئی محل ہوتا ہے، اور اسی کے لحاظ سے اس کے لیے موزوں یا غیر موزوں الفاظ ہوتے ہیں۔ جدید علم اللسان میں اس کو الفاظ کا رجسٹر (Register) کہا جاتا ہے۔ ہر زبان میں استعمال کے اعتبار سے الفاظ کے مختلف "رجسٹر" ہوتے ہیں۔ ایک لفظ ایک موقع کے لیے درست ہوتا ہے، مگر وہی لفظ کسی دوسرے موقع کے لیے درست نہیں ہوتا۔ اس لیے لکھنے یا بولنے والے کو چاہیے کہ وہ اس فرق کو جانے۔ وہ جس موضوع پر لکھ یا بول رہا ہے اس کے رجسٹر سے اپنے لیے الفاظ کا انتخاب کرے۔

اسلام دینِ کامل ہے۔ اس میں ہر معاملہ کے بارہ میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ مذکورہ مثال ظاہر کرتی ہے کہ اسلام میں اس لسانی مسئلہ کو بھی بتا دیا گیا کہ الفاظ کا رجسٹر ہوتا ہے اور آدمی کو چاہیے کہ وہ رجسٹر کے لحاظ سے موضوع کلام کے مطابق الفاظ استعمال کرے۔ وہ رجسٹر کے باہر کے الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کرے۔

چند مثالیں

یہ کسی ایک زبان کی بات نہیں۔ بلکہ اس اصول کا تعلق ہر زبان سے ہے۔ ہر زبان میں ایسا ہوتا ہے کہ بعض الفاظ استعمال کے اعتبار سے کسی متعین مفہوم کے لیے خاص ہو جاتے ہیں ایسے الفاظ کے سلسلے میں ضروری ہے کہ صرف ان کا لغوی مفہوم نہ دیکھا جائے بلکہ ان کا استعمالی مفہوم بھی دیکھا جائے اور ان کو لکھتے یا بولتے ہوئے ان کے استعمالی مفہوم کا لحاظ رکھا جائے۔

اوپر ہم نے عربی زبان کی مثال نقل کی ہے۔ اب ذیل میں اردو اور انگریزی زبان کی ایک ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔

سورہ کہف (آیت ۱۸) میں اصحاب کہف کے سونے کی کیفیت بیان ہوئی ہے یہ اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی انتظام تھا۔ چنانچہ اس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر "تدبر قرآن" میں لکھتے ہیں:

"وہ غار میں محو خواب تھے لیکن صورت حال ایسی تھی کہ اگر اتفاق سے کوئی ان کو دیکھ پاتا تو یہ گمان نہ کرتا کہ وہ سو رہے ہیں بلکہ وہ یہی سمجھتا کہ جاگ رہے ہیں۔ یعنی ان کو سوتا اور بے خبر سمجھ کر کوئی ان کو نقصان پہونچانے کی جرأت نہ کر سکتا بلکہ ان کو اپنی حفاظت کے لیے بیدار و ہوشیار خیال کرتا۔ ان کے سونے کی ہیئت ایسی تھی کہ معلوم ہوتا کہ کچھ لوگ ذرا دم لینے کے لیے بس لیٹ گیے ہیں۔ ایسی نہیں کہ دیکھنے والا سمجھے کہ انتہائی غفلت پڑکر سو رہے ہیں"

اوپر کی عبارت میں خط کشیدہ لفظ پر غور کیجیے۔ یہ خالص لغوی معنی کے اعتبار سے درست ہے۔ مگر تفسیر قرآن اور اصحاب کہف کے تذکرہ میں اس لفظ کا استعمال قطعاً موزوں نہیں۔ موضوع کے اعتبار سے یہ رجسٹر سے باہر کا لفظ ہے جس کو یہاں بے تکلف استعمال کیا گیا ہے۔

راقم الحروف کی کتاب "پیغمبر انقلاب" میں صفحہ ۶۲ پر حضرت اسامہ بن زید کی مہم کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق کو اس کی اہمیت کا اتنا زیادہ احساس تھا کہ آپ "لشکر کو خود رخصت کرنے کے لیے پیدل چل کر لشکرگاہ تک پہونچے۔ اسامہ بن زید کو ان کے لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ جب اسامہ اپنی سواری پر چلے تو حضرت ابو بکر صدیق بھی ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے۔"

اس عبارت کے آخری فقرہ کا انگریزی ترجمہ ایک صاحب نے ان الفاظ میں کیا:

With Usamah aloft on his mount, the Caliph of the Muslims walked alongside, chatting with him.

یہاں Chatting کا لفظ خالص لغت کے اعتبار سے غلط نہیں ہے۔ مگر وہ استعمال کے اعتبار سے سراسر غلط ہے۔ کیوں کہ Chatting کا لفظ انگریزی زبان میں غیر سنجیدہ گفتگو کے لیے مستعمل ہے نہ کہ خلیفۂ اسلام جیسی مقدس شخصیت کی سنجیدہ گفتگو کے لیے۔

ایک انگریزی کتاب

موجودہ زمانہ میں الفاظ کے رجسٹر کے موضوع پر بڑی بڑی تحقیقی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یہاں ہم ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈوائٹ بولنگر کی کتاب کا حوالہ دیں گے جو کہ حسب ذیل ہے:

Dwight Bolinger, *Aspects of Languages*
Harcourt Brace Jovanovich, Inc., New York 1975, pp. 682

پروفیسر بولنگر نے "رجسٹر" کے مسئلہ پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔ اور مختلف پہلوؤں سے بہت سی مثالیں نقل کی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ کہتے ہیں :

While shouts of 'Amen', 'Right on' would be appropriate to spur on the minister of a revival meeting in a small Southern church, the professor giving a lecture on astrophysics at a university would be surprised to receive encouragement in such a form. (p.358)

ایک مذہبی معلم عبادت خانہ میں وعظ کہہ رہا ہو اور حاضرین آمین اور بارک اللہ کہیں تو یہ وہاں کے لیے بالکل مناسب ہوگا۔ لیکن ایک پروفیسر اگر فلکیاتی طبیعیات کے موضوع پر یونیورسٹی میں لکچر دے تو پروفیسر سخت حیرت میں پڑ جائے گا اگر سامعین اس طرح کے کلمات سے اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگیں۔

اسی طرح وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں :

If a person is being served at table, rather than 'No more, please' it may be considered better manners to say 'Thank you' with a headshake or a gesture of the hand. (p.361)

ایک شخص کھانے کی میز پر ہو اور وہ مزید کھانے سے معذرت کرنا چاہے تو بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ سر یا ہاتھ کے اشارے کے ساتھ کہے کہ شکریہ۔ اس کے بجائے اگر وہ کہے کہ "اب نہیں" تو یہ آداب کلام کے خلاف ہوگا۔

اسی طرح ایک اور پہلو سے مثال دیتے ہوئے پروفیسر بولنگر لکھتے ہیں :

A sentence such as 'Secretary Kissinger was worried about the agreement' may cast an overly personal light on an affair of state; if we say that he was 'apprehensive' we make him a diplomat again. (p.613)

انگریزی زبان میں Worry اور Apprehension معنی کے اعتبار سے ملتے جلتے الفاظ ہیں۔

مگر مذکورہ فقرہ میں worry کا استعمال درست نہیں۔ کیوں کہ سکریٹری کسینجر کے ساتھ Apprehensive کا لفظ ان کے ڈپلومیٹ ہونے کی حیثیت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے جب کہ Worried کے لفظ میں ان کی حیثیت ایک عام انسان جیسی ہو کر رہ جاتی ہے۔

جس طرح مختلف مواقع کے لیے استعمال کی زبان الگ الگ ہوتی ہے، اسی طرح مذہبی کلام اور غیر مذہبی کلام کے لیے بھی الفاظ کا رجسٹر الگ الگ ہوتا ہے۔ جدید ترقی یافتہ زبانوں کے اچھے مصنفین اس معاملہ میں بہت محتاط ہوتے ہیں۔ وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں اسی کے رجسٹر سے اپنے لیے الفاظ لیتے ہیں۔ وہ کبھی دوسرے موضوع کے رجسٹر سے الفاظ لینے کی غلطی نہیں کرتے۔

بدقسمتی سے اردو زبان ابھی اس معاملہ میں بہت پیچھے ہے۔ یہاں کسی چیز کا کوئی معیار نہیں۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے مشہور مصنفین بھی اس طرح لکھتے ہیں جیسے کہ وہ اس بات کو جانتے ہی نہ ہوں کہ الفاظ کا الگ الگ رجسٹر ہوتا ہے۔ اور کسی موضوع پر لکھتے ہوئے آدمی کو اسی رجسٹر سے الفاظ لینے چاہئیں جو اس کے موضوع سے مطابقت رکھتے ہوں۔

تفسیر قرآن

قرآن کی تفسیر بلاشبہ سب سے زیادہ مقدس موضوع ہے۔ تفسیر کی کتاب میں اس قسم کا لسانی عیب قطعاً نہیں ہونا چاہیے۔ مگر اردو زبان میں معیار بندی نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہے کہ تفسیر کی کتابیں بھی اس سے خالی نہیں۔ اس سلسلہ میں ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کا ترجمہ سب سے زیادہ واضح مثال ہے۔ اس میں تقریباً صفحہ صفحہ پر اس قسم مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں کہ مترجم نے رجسٹر سے باہر کے الفاظ کو قرآنی آیات کے ترجمہ کے لیے استعمال کیا ہے۔

تاہم دوسرے نسبتاً محتاط مفسرین کی کتابیں بھی اس عیب سے خالی نہیں۔ یہاں ہم چند مشہور مفسرینِ قرآن کی مثال سے اس معاملہ کو واضح کریں گے۔ آئندہ جو اقتباسات دیئے جارہے ہیں ان میں نشان زد الفاظ پر غور کیجیے۔ یہ واضح طور پر تفسیر کی زبان کے لیے موزوں نہیں۔ یہ رجسٹر سے خارج الفاظ ہیں جن کو مقدس کلام کے ترجمے وتشریح کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

سورہ کہف (آیت ۵۰) میں شیطان کی ذریت (وذریتہ) کا لفظ ہے۔ قرآن کی اس آیت کا ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی نے ان الفاظ میں کیا ہے :

"سو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے، وہ جنات میں سے تھا۔ سو اس نے اپنے رب کے حکم سے عدول کیا۔ سو کیا پھر بھی تم اس کو اور اس کے چیلے چانٹوں کو دوست بناتے ہو مجھ کو چھوڑ کر، حالاں کہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔"

سورہ مائدہ (آیت ۳۸) میں سارق اور سارقہ کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ مولانا عبد الماجد دریا بادی نے ان الفاظ میں کیا ہے :

" اور چوٹٹے اور چوٹٹی دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔ ان کے کرتوتوں کے عوض میں، اللہ کی طرف سے بطور عبرتناک سزا کے۔ اور اللہ بڑا قوت والا، بڑا حکمت والا ہے۔"

سورہ النور (آیت ۳۲) میں نکاح کا ایک حکم ہے۔ اس کا ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی نے ان الفاظ میں کیا ہے :

" اور اپنی رانڈوں اور رنڈوؤں اور ذی صلاحیت غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کرو۔ اگر وہ تنگ دست ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے۔"

تفہیم القرآن کی مثال

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی "تفہیم القرآن" اردو تفسیر کی مشہور کتاب ہے۔ مگر اس میں کثرت سے ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن میں "رجسٹر" سے انحراف کیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم تفہیم القرآن سے کچھ مثالیں پیش کریں گے۔

۱۔ سورہ نساء (آیت ۱۵۷) میں یہود کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے کہ وہ خود کہتے ہیں کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کیا ہے۔ اس آیت کے تحت تفہیم القرآن میں جو حاشیہ ہے اس کا ایک فقرہ یہ ہے :

"(حضرت یحیٰی) نے دربار کی برائیوں پر تنقید کی تو اسے برداشت نہ کیا گیا۔ پہلے جیل بھیجے گئے۔ اور پھر والئ ریاست کی معشوقہ کے مطالبے پر ان کا سر قلم کر دیا گیا۔

یہودیوں کے اس ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے زعم میں مسیح کو سولی پر چڑھانے کے بعد سینے پر ہاتھ مار کر کہا ہو کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے ۔"

۲۔ سورہ ابراھیم میں قیامت کا بیان ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد ہوا ہے کہ

اور جب (قیامت میں) معاملہ کا فیصلہ ہو جائے گا تو شیطان کہے گا کہ بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے وعدہ کیا تو میں نے اس کے خلاف کیا۔ اور مجھے تمہارے اوپر کوئی اختیار نہ تھا۔ میں نے تم کو بلایا تو تم نے میری بات مان لی۔ اب مجھ کو ملامت نہ کرو اپنے آپ کو ملامت کرو۔ نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو۔ میں خود اس سے بیزار ہوں کہ تم اس سے قبل مجھ کو شریک ٹھیراتے تھے۔ یقیناً ظالموں کے لیے دردناک سزا ہے (ابراھیم ۲۲)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے صاحبِ تفہیم نے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

"(شیطان اپنے پیروؤں سے کہے گا کہ) اگر آپ حضرات ایسا کوئی ثبوت رکھتے ہوں کہ آپ خود راہِ راست پر چلنا چاہتے تھے اور میں نے زبردستی آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو غلط راستہ پر کھینچ لیا تو ضرور اسے پیش فرمائیے۔ جو چور کی سزا سو میری۔۔۔ اپنی اس دعوت کا ذمہ دار تو بلاشبہ میں خود ہوں اور اس کی سزا بھی پا رہا ہوں۔ مگر آپ نے جو اس پر لبیک کہا اس کی ذمہ داری آپ مجھ پر کہاں ڈالنے چلے ہیں۔ اپنے غلط انتخاب اور اپنے اختیار کے غلط استعمال کی ذمہ داری تو آپ کو خود ہی اٹھانی چاہیے۔"

۳۔ سورہ نحل (آیت ۲۸) میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن اہل کفر اپنے کو بے سہارا پائیں گے تو وہ سرکشی چھوڑ کر اطاعت ظاہر کرنے لگیں گے اور کہیں گے ہم تو کوئی برائی نہیں کرتے تھے۔ اس آیت کی تشریح تفہیم القرآن میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"کفار کی روحیں جب قبض کی جاتی ہیں تو وہ موت کی سرحد کے پار کا حال بالکل اپنی توقعات کے خلاف پا کر سراسیمہ ہو جاتی ہیں اور فوراً سلام ٹھونک کر ملائکہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتی ہیں کہ ہم کوئی برا کام نہیں کر رہے تھے۔ جواب میں ملائکہ ان کو ڈانٹ

بتاتے ہیں اور جہنم داخل ہونے کی پیشگی خبر دیتے ہیں ؟

۴۔ تفہیم القرآن میں سورہ روم کے دیباچہ میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح ایسا ہوا کہ رومیوں کے اوپر ایرانیوں نے فتح حاصل کی۔ اس کے بعد حالات بدلے اور دو بارہ رومیوں کا ایرانیوں کے اوپر غلبہ ہو گیا۔ اس سلسلے میں پڑھنے والوں کو حسب ذیل فقرہ ملتا ہے :

"اس وقت سلطنت روم پر ایران کے غلبے کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ مکّہ کے مشرکین اس پر بغلیں بجا رہے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ دیکھو ایران کے آتش پرست فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہم عرب کے بُت پرست بھی تمہیں اور تمہارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے "

۵۔ سورہ الحج (آیت ۱۱) میں منافقانہ طور پر اسلام کو اختیار کرنے والوں کا ذکر ہے۔ وہ کنارہ پر رہ کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اگر فائدہ کی امید ہو تو ٹھیرے رہتے ہیں اور اگر کوئی مصیبت دیکھتے ہیں تو فوراً واپس چلے جاتے ہیں۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"یعنی دائرہ دین کے وسط میں نہیں بلکہ کنارے پر، یا بالفاظ دیگر کفر و اسلام کی سرحد پر کھڑا ہو کر بندگی کرتا ہے۔ جیسے ایک مذبذب آدمی کسی فوج کے کنارہ پر کھڑا ہو۔ اگر فتح ہوتی دیکھے تو ساتھ آملے۔ اور شکست ہوتی دیکھے تو چپکے سے سٹک جائے۔"

۶۔ سورہ المومنون (آیت ۶۴) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"یہ لفظ یہاں محض فریاد و فغاں کے معنی میں نہیں بلکہ اس شخص کی فریاد و فغاں کے معنی میں بولا گیا ہے جو کسی رحم کا مستحق نہ ہو۔ اس میں تحقیر اور طنز کا انداز چھپا ہوا ہے۔ اس کے اندر یہ معنی پوشیدہ ہیں کہ اچھا، اب جو اپنے کرتوتوں کا مزا چکھنے کی نوبت آئی تو بلبلانے لگے "

۷۔ سورہ المومنون (آیت ۱۰۰-۹۹) کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

"یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے گی تو کہنا شروع کرے گا کہ اے میرے رب، مجھے اسی دنیا میں واپس بھیج دیجئے جسے میں چھوڑ آیا ہوں۔ امید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا۔ ہرگز نہیں، یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ بک رہا ہے "

۸۔ سورہ الحج کی آیت ۳۳ قربانی کے جانوروں کے بارہ میں ہے۔ اس کی تشریح کرتے

ہوئے لکھتے ہیں کہ عرب کے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ہدی کے جانوروں کو بیت اللہ کی طرف لے جانے لگیں تو ان پر سواری کرنا یا اور کسی شکل میں ان کو استعمال کرنا جائز نہیں۔ مگر قرآن نے بتایا کہ قربانی کی جگہ پہونچنے تک تم ان جانوروں سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں :

" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ کی مہار تھامے پیدل چلا جارہا ہے۔ اور سخت تکلیف میں ہے۔ آپ نے فرمایا اس پر سوار ہوجا۔ اس نے عرض کیا کہ یہ ھدی کا اونٹ ہے۔ آپ نے فرمایا : ارے سوار ہوجا "

۹- سورہ المومنون کی آیت ۴۷-۴۵ کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور کھلی سند کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کی طرف بھیجا۔ مگر انھوں نے تکبّر کیا اور بڑی دوں کی لی۔ کہنے لگے کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لائیں۔ اور آدمی بھی وہ جس کی قوم ہماری بندی ہے۔"

۱۰- سورہ المومنون (آیت ۶۴-۶۳) میں دعوت رسالت کے منکرین کا ذکر ہے، اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے :

" مگر یہ لوگ اس معاملے سے بے خبر ہیں۔ اور ان کے اعمال بھی اس طریقہ سے مختلف ہیں۔ وہ اپنے یہ کرتوت کیے چلے جائیں گے یہاں تک کہ جب ہم ان کے عیّاشوں کو عذاب میں پکڑلیں گے تو پھر وہ ڈکرانا شروع کردیں گے۔"

۱۱- تفہیم القرآن میں سورہ احزاب کے دیباچہ میں یہودی قبیلہ بنونضیر کا قصہ درج ہے اس میں ایک مقام پر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں :

" جس روز انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کی اور اس کا راز فاش ہوا اسی روز آپؐ نے ان کو نوٹس دے دیا کہ دس دن کے اندر مدینہ سے نکل جاؤ۔ اس کے بعد تم میں سے جو یہاں پایا جائے گا قتل کردیا جائے گا۔ منافقین مدینہ کے سردار عبداللہؓ بن ابی نے ان کو ترٹی دی کہ ڈٹ جاؤ اور مدینہ چھوڑنے سے انکار کردو۔ میں دو ہزار آدمیوں کے ساتھ

تمہاری مدد کروں گا "

۱۲- سورہ حشر (آیت ۲) میں یہود کے قبیلہ بنونضیر کے اخراج کا ذکر ہے۔ اس آیت کے تحت مذکورہ تفسیر میں ایک مفصل حاشیہ درج ہے جس میں یہ الفاظ ہیں :

"یہودی اس دنیا میں ایک عجیب قوم ہے اللہ کے رسولوں کو یہ جانتے ہوئے اس نے قتل کیا ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ اور فخر کے ساتھ سینہ ٹھوک کر اس نے کہا ہے کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا "

۱۳- سورہ لیل (آیت ۱۰) کے تحت ایک مفصل حاشیہ ہے جس میں حسب ذیل الفاظ ملتے ہیں :

" اور یہ جو فرمایا گیا کہ ایسے کو ہم سخت راستہ پر چلنے کی سہولت دیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے بھلائی کے راستے پر چلنے کی توفیق سلب کرلی جائے گی --- بدی کرنا اس کے لیے آسان ہوگا اور نیکی کرنے کے خیال سے اس کو یوں محسوس ہوگا کہ جیسے اس کی جان پر بن رہی ہے۔ دوسری جگہ قرآن میں ---- منافقین کے متعلق فرمایا کہ وہ نماز کی طرف آتے بھی ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں ---- اور یہ کہ ان میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں جو راہِ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اسے اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں (التوبہ ۹۸)

۱۴- سورہ النور (آیت ۳۱) کی تشریح کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ "عورتوں کے لیے بھی غضِ بصر کے احکام وہی ہیں جو مردوں کے لیے ہیں۔ لیکن مرد کے عورت کو دیکھنے کی بہ نسبت عورت کے مرد کو دیکھنے کے معاملہ میں احکام تھوڑے سے مختلف ہیں " اس کے بعد دورِ صحابہ کے کچھ واقعات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

" شوکانی نیل الاوطار میں ابن حجر کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ عورتوں کے باہر نکلنے کے معاملہ میں ہمیشہ جواز ہی پر عمل رہا ہے۔ مسجدوں میں، بازاروں میں اور سفروں میں عورتیں تو نقاب منہ پر ڈال کر جاتی تھیں کہ مرد ان کو نہ دیکھیں۔ مگر مردوں کو کبھی یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بھی نقاب اوڑھیں تاکہ عورتیں ان کو نہ دیکھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے معاملہ میں حکم مختلف ہے (جلد ۶، صفحہ ۱۰۱) تاہم یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ عورتیں

اطمینان سے مردوں کو گھوریں اور ان کے حسن سے آنکھیں سینکیں "

۱۵۔ سورہ النور (آیت ۶۳) کا ترجمہ تفہیم القرآن میں اس طرح کیا گیا ہے:

"مسلمانو، اپنے درمیان رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا بلانا نہ سمجھ بیٹھو۔ اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے سٹک جاتے ہیں۔ رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنہ میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آجائے۔"

۱۶۔ سورہ النور (آیت ۶۱) میں ارشاد ہوا ہے کہ "تمہارے اوپر اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے گھروں سے کھاؤ ۔۔۔۔۔۔ یا اپنے دوستوں کے گھروں سے کھاؤ" اس کی تشریح کرتے ہوئے صاحب تفہیم نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

" ان میں سے کسی کے ہاں کھانے کے لیے اس طرح کی شرطوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ صاحب خانہ باقاعدہ اجازت دے تو کھائیں ورنہ خیانت ہوگی۔ آدمی اگر ان میں سے کسی کے ہاں جائے اور گھر کا مالک موجود نہ ہو اور اس کے بیوی بچے کھانے کو کچھ پیش کریں تو بے تکلف کھایا جاسکتا ہے ۔۔۔۔۔ دوستوں کے معاملہ میں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ان سے مراد بے تکلف اور جگری دوست ہیں جن کی غیر موجودگی میں اگر یار لوگ ان کا حلوا اڑا جائیں تو ناگوار گزرنا تو درکنار انھیں اس پر الٹی خوشی ہو۔"

۱۷۔ سورہ الفرقان (آیت ۷) میں ہے کہ مکہ کے منکرین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کہتے تھے کہ "یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے" اس کی تشریح کرتے ہوئے صاحب تفہیم لکھتے ہیں:

" اگر آدمی ہی رسول بنایا گیا تھا تو کم از کم وہ بادشاہوں اور دنیا کے بڑے لوگوں کی طرح ایک بلند پایہ ہستی ہونا چاہیے تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستیں اور جس کے حضور باریابی کا شرف بڑی کوششوں سے کسی کو نصیب ہوتا۔ نہ یہ کہ ایک ایسا عام آدمی خداوند عالم کا پیغمبر بنا دیا جائے جو بازاروں میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہو۔"

۱۸۔ سورہ الشعراء (آیت ۱۴۸) کی تشریح کے تحت لکھتے ہیں:

"حضرت موسیٰ نے قومِ فرعون کے ایک شخص کو ایک اسرائیلی سے لڑتے دیکھ کر ایک گھونسا مار دیا تھا جس سے وہ مر گیا۔ پھر جب حضرت موسیٰ کو معلوم ہوا کہ اس واقعہ کی اطلاع قومِ فرعون کے لوگوں کو ہو گئی ہے اور وہ بدلہ لینے کی تیاری کر رہے ہیں تو وہ ملک چھوڑ کر مدین کی طرف فرار ہو گیے تھے۔ اب جو آٹھ دس سال کی روپوشی کے بعد یکایک انھیں یہ حکم دیا گیا کہ تم پیغام رسالت لے کر اسی فرعون کے دربار میں جا کھڑے ہو جس کے ہاں تمہارے خلاف قتل کا مقدمہ پہلے سے موجود ہے تو حضرت موسیٰ کو بجا طور پر یہ خطرہ ہوا کہ پیغام سنانے کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ تو مجھے اس قتل کے الزام میں پھانس لے گا "

۱۹۔ سورہ لقمان (آیت ۳۲) میں ارشاد ہوا ہے کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب ان کی کشتی سمندر کے طوفان میں گھر جاتی ہے تو وہ یکسو ہو کر خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ ان کی کشتی کو طوفان سے بچا کر ساحل پر پہونچا دیتا ہے تو وہ دوبارہ غافل اور سرکش بن جاتے ہیں۔ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے صاحب تفہیم القرآن لکھتے ہیں :

"وہ خطرے کا وقت ٹل جانے کے بعد بے تکلف اپنے کفر، اپنی دہریت اور اپنے شرک کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں مانتے کہ انھوں نے طوفان کی حالت میں خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کچھ نشانیاں خارج میں بھی اور اپنے نفس میں بھی پالی تھیں اور ان کا خدا کو پکارنا اسی وجدان حقیقت کا نتیجہ تھا۔ ان میں سے جو دہریے ہیں وہ اپنے اس فعل کی یہ توجیہہ کرتے ہیں کہ وہ تو ایک کمزوری تھی جو بحالت اضطراب ہم سے سرزد ہو گئی۔ ورنہ درحقیقت خدا ودا کوئی نہ تھا جس نے ہمیں طوفان سے بچایا ہو۔ ہم تو فلاں فلاں اسباب و ذرائع سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔"

۲۰۔ سورہ احزاب (آیت ۳۳) میں ازواج رسول کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم لوگ گھروں میں وقار کے ساتھ رہو اور تبرج جاہلیت کا طریقہ مت اختیار کرو۔ اس سلسلہ میں صاحب تفہیم اپنے تفسیری نوٹ میں لکھتے ہیں :

"عورت کے لیے جب لفظ تبرّج استعمال کیا جائے تو اس کے تین مطلب ہوں گے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے چہرے اور جسم کا حسن لوگوں کو دکھائے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے لباس اور زیور کی شان

دوسروں کے سامنے نمایاں کرے۔ تیسرے یہ کہ وہ اپنی چال ڈھال اور چٹک مٹک سے اپنے آپ کو نمایاں کرے۔"

۲۱۔ سورہ حم السجدہ کے دیباچہ میں صاحب تفہیم نے سورہ کے موضوع اور مضمون کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے :

"بڑا ہی بد قسمت ہے وہ انسان جس کے ساتھ ایسے شیاطین جن و انس لگ جائیں جو اُسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھاتے رہیں۔ اس کی حماقتوں کو اس کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کریں اور اسے کبھی نہ خود صحیح بات سوچنے دیں نہ کسی دوسرے سے سننے دیں۔ اس طرح کے نادان لوگ آج تو یہاں ایک دوسرے کو بڑھاوے چڑھاوے دے رہے ہیں اور ہر ایک دوسرے کی شہہ پاکر نہلے پر دہلا مار رہا ہے۔ مگر قیامت کے روز جب شامت آئے گی تو ان میں سے ہر ایک کہے گا کہ جن لوگوں نے مجھے بہکایا تھا وہ میرے ہاتھ لگ جائیں تو انھیں پاؤں تلے روند ڈالوں گا۔"

اوپر جو اقتباسات نقل کیے گیے ہیں ان میں نشان زد جملوں پر غور کیجئے۔ یہ جملے اگرچہ قواعد کی رو سے درست ہیں مگر اُسلوب کے اعتبار سے یقیناً وہ موزوں نہیں۔ یہ بازار میں بولی جانے والی زبان ہے نہ کہ وہ زبان جو قرآن کی تفسیر میں لکھی جائے۔

ڈکشنری میں اگرچہ تمام الفاظ ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، استعمال کے اعتبار سے الفاظ کا الگ الگ "رجسٹر" ہوتا ہے۔ آدمی جس موضوع پر لکھ رہا ہو، اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اسی موضوع کے رجسٹر سے وہ اس کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرے۔ مذکورہ اقتباسات بتاتے ہیں کہ تفہیم القرآن کے مصنف اگرچہ تفسیر قرآن کے موضوع پر لکھ رہے تھے مگر متعدد مقامات پر انھوں نے ایسے غیر متعلق رجسٹر سے الفاظ لے لیے جو تفسیر کے مقدس موضوع سے مناسبت نہیں رکھتے تھے۔

(باقی)

ایک سفر

۶ اپریل ۱۹۸۵ کی شام کو ۱۰ بجے میں دہلی میں اپنے کمرہ میں تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ پونہ سے جناب عبدالصمد شیخ بول رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بمبئی کے احباب سے بمبئی میں اجتماع کے لیے مشورہ ہوا ہے۔ انھوں نے اجتماع کے لیے ۸-۹-۱۰-۱۱ مئی ۱۹۸۵ کی تاریخیں تجویز کی ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر یہ تاریخیں بہت ضروری نہ ہوں تو آپ اسی مہینہ کے اگلے ہفتے میں ۱۶-۱۷-۱۸-۱۹ مئی کی تاریخیں رکھ لیں۔

اس مختصر گفتگو کے بعد ٹیلی فون بند کر دیا گیا۔ صرف پانچ منٹ بعد پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوبارہ عبدالصمد صاحب پونہ سے بول رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے ابھی بمبئی سے ٹیلی فون پر بات کی ہے۔ وہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہاں ہم کو تاریخوں میں تبدیلی منظور ہے۔ اس لیے ۱۶-۱۷-۱۸-۱۹ مئی کی تاریخوں کو قطعی صورت دیدی جائے۔

دہلی سے بمبئی کا فاصلہ سولہ سو کیلو میٹر ہے۔ دہلی سے پونہ بھی تقریباً اتنے ہی فاصلہ پر واقع ہے۔ دور جدید کی خدائی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ دہلی اور پونہ اور بمبئی کے درمیان مشورہ کے ذریعہ ایک اجتماع کا پروگرام طے ہو۔ اور براہ راست متعلقہ افراد سے گفتگو کر کے اسے آخری شکل دی جائے اور یہ سب کچھ صرف پانچ منٹ میں انجام پا جائے۔ ٹیلی فون اور پھر براہ راست ڈائلنگ کے نظام نے اس دور میں مواصلات کو کتنا آسان بنا دیا ہے۔

اس کے بعد ۱۶ مئی ۱۹۸۵ کو جب میں صبح نو بجے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی سے روانہ ہوا اور سولہ سو کیلو میٹر کی دوری طے کر کے صرف ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ میں بمبئی اتر گیا تو میں نے اپنے دل میں سوچا کہ موجودہ زمانہ میں خدا نے کیوں ایسا کیا کہ فاصلوں کا خاتمہ کر دیا۔ پوری دنیا کو ایک گھر کی طرح بنا دیا گیا کہ ہر وقت دوسرے سے ربط قائم کیا جا سکے۔ ہر وقت دوسرے تک پہونچنا ممکن ہو۔

دوبارہ میرے دل نے جواب دیا کہ یہ عظیم الشان نعمت ہم کو پیغمبر آخر الزماں کی بعثت کے طفیل میں حاصل ہوئی ہے۔ آپ کی بعثت سارے عالم کے لیے ہے (لیکون للعالمین نذیرا)

آپ کی لائی ہوئی ہدایت کو تمام دنیا کے انسانوں تک پہونچنا ہے۔ اس لیے آپ کی بعثت کے بعد آنے والے دور میں خدا نے سفر اور پیغام رسانی کے معاملہ کو انتہائی سریع بنا دیا تاکہ آپ کے امتی ان کو استعمال کرکے آپ کی ہدایت کو بہ سہولت سارے عالم تک پہونچا سکیں۔ ان تیز رفتار مواصلاتی ذرائع کے دنیوی فائدے بھی ہیں۔ مگر وہ مزید عنایت کے طور پر حاصل ہوئے ہیں نہ کہ انھیں دنیوی فائدوں کے لیے یہ ذرائع کھولے گیے ہیں۔

بمبئی ہندستان کی تجارتی راجدھانی ہے بمبئی اتنا بڑا ہے کہ وہ بذات خود ایک ملک معلوم ہوتا ہے۔ بمبئی کے حجم کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہاں ۲۰ لاکھ انڈے روزانہ کھائے جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے بمبئی میں مسلمان نسبتاً کافی اچھی حالت میں ہیں۔ یہاں ان کی معقول تعداد آباد ہے۔ تجارتوں میں وہ قابل لحاظ حیثیت رکھتے ہیں۔ بڑی تعداد میں ان کے تعلیمی اور سماجی ادارے اور کالج اور اسپتال قائم ہیں۔ وغیرہ

ایک صاحب نے فرمایا کہ بمبئی کے مسلمانوں کے پاس سب کچھ ہے۔ مگر ان کی کمی یہ ہے کہ ان کی کوئی لیڈر شپ نہیں۔ اسی کمی کا یہ نتیجہ ہے کہ یہاں انفرادی سطح پر جو مواقع انھیں حاصل ہیں، ان کے لحاظ سے وہ اجتماعی کامیابی اپنے لیے حاصل نہ کرسکے۔ میں نے کہا کہ آپ سمجھتے ہیں کہ لیڈر نہیں اس لیے لیڈر شپ نہیں۔ مگر بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کی خود سری انھیں کسی لیڈر شپ کو قبول نہیں کرنے دیتی۔ اسی لیے ان کا کوئی لیڈر بھی نہیں ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ خود سر قوم بن گیے ہیں۔ اور یہی ان کے درمیان کوئی حقیقی لیڈر شپ پیدا نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

مسلمان صرف اس لیڈر کا ساتھ دے سکتے ہیں جو ان کا ساتھ دے۔ جو لیڈر ان کی خواہشات کا ساتھ نہ دے، مسلمان بھی اس کو اپنا لیڈر بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ قریبی ماضی کی تاریخ اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔

بمبئی کی آبادی تقریباً ۸۰ لاکھ ہے۔ اس میں ایک تہائی مہاراشٹری ہیں اور دو تہائی بیرونی ریاستوں کے لوگ ہیں۔ مسلمان تقریباً ۲۰ فی صد ہیں۔ تاہم "جھگی جھونپڑی" کے باشندوں

میں ان کا تناسب ۵۰ فی صد تک پہونچ جاتا ہے ۔

بمبئی ایک صنعتی شہر ہے ۔ مگر یہاں کی صنعتوں میں مسلمانوں کا حصہ غالباً ایک فی صد سے بھی کم ہوگا ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی یہ کمی ہے کہ وہ مل کر کام نہیں کر سکتے ۔ جدید دَور کی صنعت مشترکہ سرمایہ پر قائم ہوتی ہے ۔ مسلمانوں کے پاس الگ الگ اتنا سرمایہ ہے کہ اگر وہ جمع ہو سکے تو بہت بڑی بڑی صنعتیں قائم کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے ، مگر مشترکہ کام کرنے کے لیے برداشت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی وہ صفت ہے جس کو آج مسلمان سب سے زیادہ کھوئے ہوئے ہیں ۔

ایک صاحب نے کہا کہ مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں میں مسلمانوں کا کم حصہ ہونے کی وجہ اسلام کے قوانین ہیں ۔ اسلام میں سود حرام ہے حالانکہ سود ہی کی بنیاد پر بنک قائم ہوتے ہیں اور بنک سے سودی رقم لے کر تمام بڑی بڑی کمپنیاں شروع ہوتی ہیں ۔ مسلمان سودی قرض کو حرام سمجھتے ہیں اسی لیے وہ بڑے کارخانے بھی قائم نہیں کر پاتے ۔

میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ سود اسلام میں حرام ہے مگر امداد باہمی کی انجمن (کوآپریٹو سوسائٹی) بنانا تو حرام نہیں ۔ پھر مسلمان ایسا کیوں نہیں کرتے کہ امداد باہمی کی انجمنوں میں اپنی رقمیں جمع کریں اور اس کے ذریعہ سے مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں قائم کریں ۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی صنعتی پسماندگی کی وجہ ان کی بے اتحادی ہے نہ کہ سود کا مسئلہ ۔

آج ہر جگہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ معمولی سی خلاف مزاج بات پر بے برداشت ہو جاتے ہیں ۔ زندگی برداشت کا امتحان ہے اور برداشت کا سرمایہ ان کے پاس موجود نہیں ۔ مسلمانوں کی "مظلومی" ان کے بے برداشت ہونے کی قیمت ہے جس کو آج وہ ساری دنیا میں بھگت رہے ہیں ۔ اور ان کی یہی کمی ہے جو ان کے لیے جدید صنعتی دنیا میں داخلہ میں رکاوٹ بن گئی ۔

بمبئی کی یہ خصوصیت ہے کہ یہاں ایک مسلمان عبد الرحمٰن انتولے کو ریاست کا وزیر اعلیٰ (۱۹۸۰ — ۸۲) بننے کا موقع ملا ۔ عام طور پر لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا دور نہایت اچھا تھا ۔ انھوں نے بہت سے مفید کام کیے ۔ انھوں نے راتوں کو جُوا ، شراب وغیرہ کے اڈوں پر چھاپہ

مارا - اس طرح کی ایک خبر انڈین اکسپرس نے اس سرخی کے ساتھ شائع کی تھی کہ بمبئی کا ہارون رشید !

Haroon Rasheed of Bombay

مگر جلد ہی عبد الرحمٰن انتولے صاحب پر زوال آگیا۔ جہاں تک میں نے معلومات کیں، وہ ایک لائق اور باصلاحیت آدمی ہیں۔ ان کی خدمات کا لوگوں کو اعتراف ہے۔ مگر ان کو غالباً اپنے اوپر ضرورت سے زیادہ اعتماد (Over-confidence) ہو گیا۔ اور یہی چیز ان کے زوال کا سبب بن گئی ——— اپنے آپ کو کم سمجھنا اگر مضر ہے تو اپنے آپ کو زیادہ سمجھنا ہلاکت کا باعث ہو جاتا ہے۔

تاریخ انسانی کا یہ عجوبہ ہے کہ مسلمانوں کو جن لوگوں سے شکایت ہوتی ہے، وہ اپنے عمل سے خود ان لوگوں کی تقویت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو اکثریتی فرقہ کی طرف سے معاشی ظلم کی شکایت ہے۔ مگر دوسری طرف یہی مسلمان اپنے بڑھے ہوئے اسراف کی بنا پر ان کے معاشی استحصال کا شکار ہو رہے ہیں۔ شادیوں، جشنوں اور تقریبات میں خرچ کیا ہوا بے حساب سرمایہ ہر روز وہ انھیں لوگوں کے جیبوں میں ڈال رہے ہیں جن کو وہ معاشی ظالم قرار دے کر ان کے خلاف چیخ پکار کر رہے ہیں۔

بمبئی میں آپ کسی مسلمان سے گفتگو کریں تو وہ ہمیشہ شیو سینا کی شکایت کرتا ہوا ملے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ خود مسلمان ہیں جو شیو سینا کی تقویت کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ مسلمان اگر شیو سینا اور اس طرح کے دوسرے فرقہ پرست گروہوں کو یکسر نظر انداز کر دیں تو یقینی ہے کہ وہ اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ بعض اوقات دشمن کی موت دشمن کو نظر انداز کرنے میں ہوتی ہے مگر افسوس کہ مسلمان اس راز کو نہیں جانتے۔

بمبئی کارپوریشن کے الکشن (اپریل ۱۹۸۵) میں شیو سینا بڑی اکثریت سے کامیاب ہوئی ہے۔ شیو سینا کو ووٹروں کی کل تعداد کا صرف ۲۳ فی صد ملا۔ اس کے باوجود اس کی غیر معمولی کامیابی کا کم از کم ایک سبب وہی مسلمان تھے جو شیو سینا کے سب سے زیادہ نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

یہاں متعدد ایسے حلقہ انتخاب ہیں جن میں مسلم ووٹوں کی اکثریت ہے۔ مثلاً عمر کھاڑی اس حلقہ میں کل تیس ہزار ووٹر ہیں جن میں تقریباً ۲۰ ہزار مسلمان ہیں۔ مگر سننے والے تعجب کریں گے کہ مسلم اکثریت کے اس علاقہ میں بھی جو شخص کامیاب ہوا وہ شیوسینا کا امیدوار تھا۔

یہ عجوبہ کیسے ہوا۔ مسلمانوں کے باہمی اختلاف کی وجہ سے۔ عمر کھاڑی کے حلقہ انتخاب میں پانچ مسلمان امیدوار بن کر کھڑے ہوگئے۔ دوسری طرف شیوسینا کا امیدوار صرف ایک تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم ووٹ پانچ جگہ بٹ گیے اور شیوسینا کو اس کے تمام ووٹ محفوظ طور پر ملے۔ ووٹوں کی اس تقسیم کی وجہ سے پانچوں مسلم امیدوار ہار گیے اور شیوسینا کا امیدوار جیت گیا۔

مسلمان جہاں اقلیت میں ہیں وہاں مسلم اور غیر مسلم کا مسئلہ پیدا کر کے وہ اپنے کو کم کر لیتے ہیں اور جہاں وہ اکثریت میں ہیں وہاں ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر خود اپنے ہاتھوں اپنے کو کم کیے ہوئے ہیں۔

بمبئی میں پروگرام

۱۶ مئی ۱۹۸۵	بعد نماز مغرب	خطاب بمقام رتن بائی ہال
۱۷ مئی	صبح ۱۰ بجے	خواتین سے خطاب، جامعہ اصلاح البنات
	نماز جمعہ سے پہلے	باندرہ کی جامع مسجد میں خطاب
	۳ بجے	مسٹر جی ایم صدیقی کے مکان پر سوال وجواب کی نشست
	بعد نماز مغرب	باندرہ اردو، ہائی اسکول میں خطاب
	بعد نماز عشاء	سوال وجواب کی نشست باندرہ اسکول میں
۱۸ مئی	۱۲ بجے	پریس کانفرنس ریڈیو کلب میں
	۴ بجے شام	اکبر پیر بھائی ہال میں خطاب
	بعد نماز عشاء	گورنمنٹ کالونی باندرہ میں خطاب
۱۹ مئی	۱۱ بجے	مہاراشٹر کالج ہال میں خطاب

بمبئی میں بڑی تعداد میں الرسالہ (اردو، انگریزی) آتا ہے۔ کتابیں بھی کافی پھیلی ہیں۔ اب کچھ لوگوں نے یہ پروگرام بنایا ہے کہ بڑی تعداد میں غیر مسلموں میں سنجیدہ اور تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک فہرست بنائی جائے اور ان کو اپنی طرف سے الرسالہ انگریزی جاری کرایا جائے۔ یہ ایک بے حد اہم کام ہے۔ اور اس کو ہر جگہ کیا جانا چاہیے۔ الرسالہ (انگریزی) پوری مسلم دنیا میں واحد اسلامی پرچہ ہے جو خالص دعوتی انداز میں نکل رہا ہے اور اس کی زبان بھی خدا کے فضل سے نہایت اعلیٰ ہوتی ہے۔ بین اقوامی زبان میں ایسے ایک دعوتی پرچہ کا وجود میں آجانا مسلمانوں پر زبردست ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ اب یہ مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری ہے کہ اس پرچہ کو غیر مسلم حضرات تک پہونچائیں، خواہ ڈاک کے ذریعہ یا دستی طور پر ملاقات کے ذریعہ۔ ایسا نہ کرنا اپنی ذمہ داری میں زبردست کوتاہی کے ہم معنی ہے۔

اجتماعات ۱۶ مئی سے ۱۹ مئی تک مختلف مقامات پر ہوتے رہے۔ ہر جگہ مرکز کی کتابوں کا ایک اسٹال بھی لگایا جاتا رہا۔ اسٹال توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ کتابوں کی خریداری کے علاوہ لوگوں نے الرسالہ کی ایجنسی میں اپنے نام لکھائے اور اس کی خریداری قبول کی۔ ایک صاحب نے پچاس الرسالہ (۲۵ اردو، ۲۵ انگریزی) سے ایجنسی شروع کی۔

بمبئی کے اجتماعات خدا کے فضل سے کافی کامیاب رہے۔ ہر پروگرام میں تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ بڑی تعداد میں شریک ہوتا رہا۔ ۱۷ مئی کی شام کو مغرب اور عشار کے درمیان باندرہ ہائی اسکول کے ہال میں تقریر تھی۔ تقریر جاری تھی کہ عشار کی اذان ہو گئی۔ اس کے آدھ گھنٹہ بعد عشار کی جماعت ہونے والی تھی۔ مزید ۲۰ منٹ بولنے کے بعد میں نے تقریر ختم کر دی۔ پورا مجمع کہنے لگا کہ ابھی تشنگی باقی ہے۔ اس لیے عشار کی نماز کے بعد دوبارہ تقریر ہو۔ تاہم میں نے اس کو پسند نہیں کیا اور عشار کے پہلے تقریر ختم کر دی۔ اس تقریر کا موضوع تھا "اسلامی دعوت کے جدید امکانات"

۱۹ مئی کو مہاراشٹر کالج کے ہال میں تقریر تھی۔ یہ تقریر خالص علمی اور تاریخی انداز کی تھی اور ڈھائی گھنٹہ تک مسلسل جاری رہی۔ اس کے باوجود پورا مجمع آخر تک انتہائی انہماک کے ساتھ سنتا رہا۔

۱۶ مئی ۱۹۸۵ کی شام کو بمبئی کے ایک ہال میں تقریر کا پروگرام تھا۔ یہ ہال ان لوگوں کا تھا جو اپنے آپ کو سُنّی مسلمان کہتے ہیں۔ ہال باقاعدہ بک کیا گیا۔ اس کا مقررہ کرایہ

ادا کر دیا گیا۔ ضروری کارروائیوں کی تکمیل کے بعد اجتماع سے ایک دن پہلے اس کا اعلان کر دیا گیا۔
جب ساری کارروائی ہو چکی تو اجتماع سے ۲۰ گھنٹے پہلے ہال کے ذمہ داروں نے مطلع کیا کہ آپ کو ہال نہیں دیا جا سکتا "کیوں کہ آپ کے مولانا صاحب جو دہلی سے آرہے ہیں وہ دیوبندی ہیں" منتظمین اجتماع نے کہا کہ یہ بات آپ کو پہلے بتانی چاہیے تھی۔ اب تو ہم اعلان کر چکے ہیں مگر کسی قسم کی اپیل منتظمین کے لیے کارگر نہ ہو سکی۔ بالآخر قریب کے ایک اور ہال میں اجتماع کا انتظام کیا گیا۔ ۱۶ مئی کی شام کو وہاں میری ایک گھنٹہ کی تقریر ہوئی۔ مذکورہ انتشار کے باوجود ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ کرسیوں پر جگہ نہ پانے کی وجہ سے کھڑے ہوئے نظر آئے تاہم میں نے اپنی تقریر میں اس ناخوش گوار واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔
۱۹ مئی کی دوپہر کو پریس کانفرنس ہوئی۔ یہ پریس کانفرنس ریڈیو کلب میں تھی۔ ریڈیو کلب یہاں کا ایک ممتاز ادارہ ہے جو سمندر کے کنارے ایک پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ اخبارات کے اڈیٹروں اور نمائندوں کی قابل لحاظ تعداد جمع ہو گئی تھی۔ ابتداءً ان کے درمیان اسلامی مرکز کا انگریزی تعارف نامہ تقسیم کیا گیا۔ اس کے بعد میں نے مختصر طور پر خطاب کیا جس میں مرکز کے مقاصد کی وضاحت کی۔ آخر میں سوالات و جوابات ہوئے۔
سوالات و جوابات کا سلسلہ بہت دیر تک قائم رہا۔ تاہم یہ بات میرے لیے زیادہ خوشی کی نہ تھی کہ اکثر لوگ اس قسم کے سوالات پوچھتے رہے کہ مسلم پرسنل لا کے مسئلہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے بارہ میں آپ کیا کہتے ہیں۔ اردو اور مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کے بارہ میں آپ کا مرکز کیا کرنا چاہتا ہے۔
یہ سوچ کر مجھے بہت دکھ ہوا کہ اس ملک میں مسلمانوں نے اپنی جو تصویر بنائی ہے وہ بس یہ ہے کہ ان کے کچھ قومی اور مادی مسائل ہیں اور انھیں کے بارہ میں لکھنا اور بولنا سب سے بڑا مسلم مسئلہ ہے۔ مسلم مسئلہ کا یہ تصور ہلاکت خیز حد تک غلط ہے۔ مگر اس معاملہ میں ہم دوسروں کی شکایت نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ مسلمانوں کی یہ تصویر خود ہمارے اپنے لیڈروں کی بنائی ہوئی ہے نہ کہ کسی دوسرے کی۔
اس ملک میں مسلمانوں کی تصویر کیسی عجیب ہو کر رہ گئی ہے۔ میں نے سوچا کہ کاش یہاں

مجھ سے یہ سوال کیا جاتا کہ خدا کے بارہ میں اسلام کا تصور کیا ہے۔ آخرت کی اتنی زیادہ اہمیت اسلام میں کیوں ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم کیوں ہو گئی۔ انسان کی نجات صرف اسلام کو اختیار کرنے میں کیوں ہے۔

اس قسم کے سوالات کیوں نہیں کیے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے موقع پر ہمیشہ دوسروں کی طرف سے وہی سوالات پیش آتے ہیں جو عملاً ماحول کے اندر چھڑے ہوئے ہوں۔ مسلمان چونکہ یہ نہیں کرتے کہ وہ توحید اور آخرت جیسے سوالات کو عوامی سطح پر ابھاریں۔ مسلمان اس حیثیت سے لوگوں کے سامنے آتے ہیں کہ وہ ایسا گروہ ہیں جن سے کچھ چھینا گیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس حیثیت سے متعارف نہیں کرتے کہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو دوسروں کو ان سے لینا چاہیے۔ وہ اس ملک میں صرف مانگنے والے گروہ بنے ہوئے ہیں۔ وہ دینے والے گروہ نہ بن سکے۔ ایسی حالت میں دوسرے بھی ان سے وہی سوال کرتے ہیں جو ایک کھوئے ہوئے گروہ سے کیا جاتا ہے۔ وہ ان سے وہ سوال نہیں کرتے جو ایسے گروہ سے کیا جاتا ہے جو کوئی چیز پائے ہوئے ہو۔

پریس کانفرنس میں ایک مسلم صحافی نے کہا کہ آپ ملت کی تعمیر کا جو طریقہ بتاتے ہیں وہ تو بہت دیر طلب ہے۔ اتنے دیر طلب طریقہ کو کیسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگوں کی مشکل یہ ہے کہ آپ لوگ ہمیشہ الٹا اہرام (Inverted pyramid) بناتے ہیں۔ آپ واقعہ کو سنسنی خیز بنانے کے لیے یہ کرتے ہیں کہ جب کوئی خبر مرتب کرتے ہیں تو اس کو الٹ دیتے ہیں۔ یعنی جو آخری بات ہے اس کو سب سے پہلے بیان کرتے ہیں۔ مگر الٹا اہرام صرف کاغذ کے صفحہ پر بنتا ہے۔ زمین پر کوئی حقیقی اہرام جب بھی بنے گا اسی طرح بنے گا کہ بنیاد سے کام شروع کر کے اس کو اس کی آخری چوٹی تک پہونچانے کی کوشش کی جائے۔

ہفتہ وار بلٹز (یکم جون ۱۹۸۵) نے بمبئی کی پریس کانفرنس پر جو نوٹ شائع کیا تھا وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"مولانا وحید الدین خاں کو بھلا کون نہیں جانتا۔ "الرسالہ" جیسے دینی اور علمی پرچہ

سے انھوں نے سارے ہندستان میں دھوم مچار کھی ہے۔ مولانا نے خاص طور سے عصر جدید، سائنس اور اسلام کے تعلق سے معرکۃ الآرا کتابیں لکھی ہیں۔ یہ بات بالکل پکی ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر کتابیں آج تک نہیں لکھی گئیں۔ اسی لیے مولانا کی کتابیں اسلامی ممالک کے کئی یونیورسیٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل کرلی گئی ہیں۔ نیز ان کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں کیا جاچکا ہے۔ مولانا وحید الدین کی اپنی ایک سوچ ہے اور اپنا ایک اندازِ فکر — وہ ٹکراؤ کی پالیسی پر عمل نہیں کرتے۔ لیکن مصلحت پرستی کا شکار بھی نہیں۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کی ہمت بڑھاتے ہیں حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے، زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کا سامنا کرنے کے لیے۔

گذشتہ دنوں مولانا وحید الدین نے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کیا مولانا نے اپنے انوکھے مگر کار آمد مقصد کے حصول کے لیے ۱۹۷۰ء میں سی۔ ۲۹ نظام الدین، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ میں اسلامک سنٹر کی بنیاد ڈالی تھی۔ اب مولانائے محترم نے اپنے مقبول ترین جریدے "الرسالہ" کو انگریزی کا روپ بھی دے دیا ہے تاکہ ان کا مشن تیز سے تیز تر ہو سکے "۔

بمبئی کے دوران قیام لوگ برابر ملتے رہے اور طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ کچھ لوگوں نے کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن کے خلاف رٹ پٹیشن کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ اس پٹیشن کو ہر حال میں خارج ہونا تھا۔ چنانچہ وہ ۱۳ مئی ۱۹۸۵ کو خارج کر دی گئی۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی سوچ کامل طور پر منفی ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی واقعہ کے صرف منفی پہلو کو دیکھ پاتے ہیں۔ اس کی قیمت انھیں اس شکل میں مل رہی ہے کہ وہ بہت سے فائدوں سے مستقل طور پر محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔

اس طرح کا واقعہ ہمیشہ لوگوں میں ایک تجسس ابھارتا ہے اور ایک نئی صورت حال پیدا کرتا ہے۔ اس صورت حال کو استعمال کرکے زبردست فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ مثلاً رٹ پٹیشن کا واقعہ ایک سنسنی خیز واقعہ تھا۔ اس سے لوگوں میں یہ سوال ابھرا کہ قرآن کی تعلیمات کیا ہیں۔ اس موقع پر اگر اچھے انداز میں اسلام کی تعلیمات پیش کی جاتیں تو لوگ بہت توجہ سے سنتے اور پڑھتے مگر ہمارے اسلامی لیڈر یہ کام نہ کر سکے۔ وہ اپنی منفی ذہنیت کی بنا پر صرف

احتجاج اور شکایت کرنے میں مشغول رہے ۔ صرف ایک صاحب کا مضمون سامنے آیا ۔ یہ ٹائمس آف انڈیا کی بمبئی اور نئی دہلی دونوں جگہ کی اشاعتوں میں تین قسطوں (۱۴ - ۱۵ - ۱۶ مئی ۱۹۸۵) میں چھپا ۔ اس کا عنوان تھا قرآن اور اس کا پیغام (The Quran And Its Message) مگر اس کے لکھنے والے کوئی عالم نہ تھے اس لیے وہ موضوع کی صحیح ترجمانی نہ کرسکے ۔ ان کے مضمون میں قرآن کی تعلیمات کو اس انداز میں پیش کیا گیا تھا گویا کہ قرآن وحدت ادیان کا حامی ہے ۔

یہ ایک بہترین موقع تھا کہ انگریزی ، ہندی ، بنگالی ، تامل ، تلگو ، ملیالم ، ہر زبان کے عوامی اخباروں میں اعلیٰ درجہ کے تعارفی مضامین شائع کیے جاتے ۔ مگر تمام مسلمان احتجاج میں مبتلا رہے اور یہ ضروری کام انجام نہ پاسکا ۔

۱۹ مئی ۱۹۸۵ کی سہ پہر کو نہرو پلانیٹیریم دیکھا ۔ نہرو پلانیٹیریم جب بنا تھا تو اس کے بارہ میں الرسالہ (فروری ۱۹۷۷) میں ایک مضمون شائع کیا گیا تھا ۔ اب اس کو دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ۔ بمبئی کے ایک صاحب جو ہمارے قافلہ کے ساتھ تھے ، انھوں نے کہا کہ آج میں پہلی بار اس کو دیکھ رہا ہوں ۔ انھوں نے کہا کہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بمبئی کے پڑھے لکھے مسلمانوں میں شاید ۵ فی صد بھی نہ ہوں گے جنھوں نے اس پلانیٹیریم کو دیکھا ہو ۔ مسلمان یا تو حاجی علی کی درگاہ جاتے ہیں یا چوپاٹی جیسے تفریحی مقامات پر ۔

پلانیٹیریم میں وسیع کائنات کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے ۔ شمسی نظام اور ستاروں اور کہکشاؤں کی گردش کے مناظر دکھائے جاتے ہیں ، یہ ایک عجیب حیران کن تجربہ ہوتا ہے ۔ میں نے اس کو دیکھا تو وسیع کائنات میں بے شمار انتہائی بڑے بڑے اجسام کی گردش کے منظر نے دل کی عجیب کیفیت کردی ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کہ میں خدا کی ایک نئی صفت کو دریافت کر رہا ہوں یہ صفت میری اپنی زبان میں خود اعتمادی (Self-confidence) تھی ۔ میں نے سوچا کہ اتنے وسیع خلا میں اتنے بے شمار اجسام کو پیدا کرکے ان کو متحرک کرنا ایک بہت بڑا خطرہ مول لینا ہے ۔ کیوں کہ ہر آن یہ اندیشہ ہے کہ یہ اجسام آپس میں ٹکرا کر تباہ ہوجائیں ۔ ایسے حال میں کائنات کو پیدا کرنے کے لیے بے پناہ خود اعتمادی درکار تھی ۔ کیسا عجیب طاقتوں والا ہے وہ خدا جس نے اس عظیم کائنات کو پیدا کیا اور ان کو خلائی وسعتوں میں اس طرح متحرک کردیا کہ اربہا ارب

سال گزر جانے کے باوجود کہیں کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا۔

بمبئی سے واپسی کے بعد وہاں سے جو خطوط ملے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سفر خدا کے فضل سے کامیاب تھا۔ ایک صاحب بمبئی سے لکھتے ہیں :

"آپ کے بمبئی آنے سے جو بہار آئی تھی اس کا اثر آج بھی تمام ساتھی محسوس کر رہے ہیں اور پھر منتظر ہیں کہ موسم بہار جلد لوٹے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وتندرستی عطا فرمائے اور آپ کا سایہ تا دیر ہم پر قائم رکھے تاکہ ایمانی حرارت پیدا کرنے کا کاز زیادہ سے زیادہ وسیع ہو سکے (۱۹ جولائی ۱۹۸۵)

وہاں کے لوگوں میں خدا کے فضل سے کام کی نئی لگن پیدا ہوئی۔ الرسالہ کی کئی بڑی ایجنسیاں قائم ہوئیں۔ روزنامہ انقلاب (۱۰ اگست ۱۹۸۵) کے ایک اعلان سے معلوم ہوا کہ "الرسالہ فرینڈس سرکل بمبئی" کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ جس نے بڑے پیمانہ پر کام کو پھیلانے کا نقشہ بنایا ہے۔ اس کا پہلا اجتماع ۱۰ اگست ۱۹۸۵ کو ڈونگری (بمبئی) میں ہوا۔

الرسالہ کیسٹ

صدر اسلامی مرکز کی آواز میں ماہانہ "الرسالہ کیسٹ" خدا کے فضل سے پابندی سے تیار ہو رہا ہے اور ہر ماہ خریداروں کے نام روانہ کیا جا رہا ہے۔ موجودہ منصوبہ کے مطابق دسمبر ۱۹۸۵ تک کے کیسٹ کی تفصیل حسب ذیل ہے :

کیسٹ نمبر	۱	ایمان
کیسٹ	۲	جدید امکانات
کیسٹ	۳	اسلامی اخلاق
کیسٹ	۴	اتحاد
کیسٹ	۵	تعمیر ملت

عنقریب انشاء اللہ ان تمام کیسٹوں کی تقریریں کتاب کی صورت میں بھی شائع کر دی جائیں گی۔

۱۔ جناب مفتی ثمین اشرف صاحب (مقیم سلالہ، مسقط) نے بتایا کہ جامعہ شنفری (سلالہ) کے خطیب شیخ محمد سعید مدکور (مصری) نے حالیہ رمضان سے پہلے جو خطبات دیئے ان میں مسلسل تین جمعہ کے خطبوں کا موضوع الاسلام یتحدیٰ تھا۔ انھوں نے الاسلام یتحدیٰ سے توحید اور اسلامی عقائد کے سائنسی دلائل کو لے کر تفصیل سے بیان کیا اور لوگوں کو اس عربی کتاب کے پڑھنے کی ترغیب دی ــــــــ اس طرح کی خبریں مختلف عرب ممالک سے بار بار ملتی رہتی ہیں ۔ یہ کتاب " مذہب اور جدید چیلنج " کا عربی ترجمہ ہے ۔

۲۔ صدر اسلامی مرکز نے جولائی ۱۹۸۵ میں حیدرآباد کا سفر کیا۔ وہاں دو دن میں موصوف کی تین تقریریں ہوئیں۔ لوگ غیر معمولی طور پر بڑی تعداد میں ہر اجتماع میں شریک ہوئے۔ ان تقریروں کا ٹیپ مقامی طور پر کئی آدمیوں نے لیا۔ مرکز میں بھی ان تقریروں کا ٹیپ موجود ہے ۔

۳۔ حسب ذیل کتابوں کے انگریزی ترجمے تیار ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی شائع کر دیئے جائیں گے۔
پیغمبر انقلاب ، اسلام دین فطرت ، تبلیغی تحریک ، آخری سفر۔

۴۔ ۱۹ جولائی ۱۹۸۵ کو گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں سب اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک تھے ۔ صدر اسلامی مرکز نے بعض احادیث کی روشنی میں بتایا کہ اسلام کے تقاضے کیا ہیں۔ حاضرین کی تجویز پر طے ہوا کہ اس طرح کا اجتماع یہاں ہر ماہ کیا جائے ۔ صدر اسلامی مرکز کی اس تقریر کا ٹیپ اسلامی مرکز میں محفوظ ہے ۔

۵۔ ۲۸ جولائی ۱۹۸۵ (مہینہ کے آخری اتوار) کو حسب معمول مرکز میں ماہانہ درس قرآن کا اجتماع ہوا۔ اخبارات میں بھی اس کی اطلاع شائع ہوگئی تھی ۔ انگریزی روزنامہ ہندستان ٹائمس (۲۸ جولائی ۱۹۸۵) نے اس کا اعلان حسب ذیل الفاظ میں شائع کیا تھا :

ISLAMIC CENTRE: Maulana Wahiduddin Khan, president of the Centre, to speak on the meanings of the Quran; C-29, Nizamuddin West; 7 p.m.

۶۔ نماز مغرب کے فوراً بعد مرکز کے بڑے کمرے میں اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے سورہ الانشراح کی روشنی میں درس دیا۔ اس درس کا ٹیپ مرکز میں محفوظ ہے ۔ انگریزی اخبارات

میں اعلان کی وجہ سے درس میں کئی غیر مسلم حضرات بھی شریک ہوئے۔

۷۔ "الامہ" عالم عرب کا مشہور مجلّہ ہے۔ اس نے اپنی اشاعت (ذوالقعدہ ۱۴۰۵ھ) میں ایک مقالہ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے "وحیدالدین خان" اس مقالہ میں نہایت اعلیٰ انداز میں اسلامی مرکز اور اس کے صدر کی اسلامی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اس طرح کے مضامین عالم اسلام کے مختلف جرائد میں برابر شائع ہو رہے ہیں۔

۸۔ قاہرہ (مصر) سے اطلاع ملی ہے کہ صدر اسلامی مرکز کی تین مزید کتابوں کے عربی ترجمے شائع ہو گیے ہیں۔ یہ ترجمے مصری ادیبوں نے کیے ہیں جو کہ اردو زبان بخوبی جانتے ہیں۔ انھوں نے براہِ راست اردو سے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔

۹۔ اگست کے مہینہ میں جو لوگ اسلامی مرکز میں تشریف لائے ان میں سے ایک حضرت پیر سعید میاں صاحب مجددی (بھوپال) تھے۔ حضرت ۱۰ اگست ۱۹۸۵ کو تشریف لائے اور دیر تک مرکز میں رہے۔ مرکز کے کاموں کو دیکھ کر بہت زیادہ خوشی کا اظہار فرمایا اور بار بار اس کے لیے دعائیں دیں۔

۱۰۔ ۱۶ اگست ۱۹۸۵ کی شام کو وسنت وہار (نئی دہلی) میں ایک نشست ہوئی۔ اس میں صدر اسلامی مرکز نے شرکت کی۔ اس نشست میں دینی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ صدر اسلامی مرکز نے خاص طور پر اس پہلو کو نمایاں کیا کہ ہندستان میں اسلام کے لیے کام کرنے کے مکمل مواقع موجود ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ لوگوں میں مثبت نقطۂ نظر پیدا ہو جائے۔

۱۱۔ یہ طے کیا گیا ہے کہ ادارہ الرسالہ کی بعض کتابیں صدر اسلامی مرکز کی آواز میں ریکارڈ کرا دی جائیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے "اسلامی زندگی" نامی کتاب کا انتخاب کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ پوری کتاب چند کیسٹوں کے سٹ کی صورت میں ریکارڈ کرائی جائے گی۔

یہ طے کیا گیا ہے کہ کیسٹ کے موجودہ پروگرام کے ساتھ لانگ پلے ریکارڈ بھی تیار کرائے جائیں اس سلسلہ میں جو لوگ دلچسپی رکھتے ہوں وہ ادارہ کو مطلع فرمائیں۔

۱۲۔ الرسالہ کیسٹ خدا کے فضل سے بہت پسند کیا گیا ہے۔ دوسرا کیسٹ (یکم ستمبر ۱۹۸۵) کا عنوان ہے "اسلامی دعوت کے جدید امکانات" تیسرا کیسٹ (یکم اکتوبر ۸۵) انشاء اللہ اسلامی اخلاق

کے موضوع پر ہوگا۔

۱۳۔ الرسالہ کیسٹ کے سلسلہ میں جو مختلف تاثرات ہم کو موصول ہوئے ہیں ان میں سے چند یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ ایک صاحب گلبرگہ سے لکھتے ہیں: "جولائی کا کیسٹ ملا۔ اگلے دن میں تمام دن مختلف محلوں میں جاکر مولانا وحیدالدین خان صاحب کی تقریر ایمان سناتا رہا۔ تمام لوگوں نے خشوع وخضوع کے ساتھ سنا۔ اور کہا کہ ایمان تازہ ہوگیا۔ اور ہم مادی فضا سے نکل کر دینی فضا میں آگیے۔ (۲۲ جولائی ۱۹۸۵) ایک صاحب سری نگر سے لکھتے ہیں: "ایمان پر کیسٹ سنا۔ بے شک میری روح کو تسکین مل گئی۔ اب نئے سرے سے زندگی شروع کرنی ہے" (۲۰ جولائی ۱۹۸۵) ایک صاحب کشمیر سے لکھتے ہیں: "آپ کا کیسٹ چند ساتھیوں کے ساتھ سنا۔ اللہ ہمیں وہی زندہ ایمان عطا کرے جس کی آپ نے نشاندہی فرمائی ہے۔ الرسالہ کیسٹ کا پروگرام نہایت موثر اور کامیاب پروگرام ثابت ہوگا۔ اور یہ ایک بہت بڑے خلا کو پُر کرے گا۔ (۲۳ جولائی ۱۹۸۵) ایک صاحب راجستھان سے لکھتے ہیں: جولائی والا ایمان کا کیسٹ ہم سب لوگوں نے سنا۔ بڑا لرزہ خیز اور بڑا موثر ہے" (یکم اگست ۱۹۸۵) ایک صاحب بمبئی سے لکھتے ہیں: "الرسالہ کیسٹ مجھے بہت پسند آیا۔ آپ کی موثر آواز نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ کیسٹ کا مضمون بھی ایمان افروز ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ الرسالہ کی روشنی دور دور تک پہونچے اور تاریک ذہنوں کو منور کرے۔ (۷ اگست ۱۹۸۵) ایک صاحب سعودی عرب سے لکھتے ہیں: "ایمان پر تقریر کا کیسٹ ملا۔ یہ چیز بے انتہا اچھی اور پُراثر ہے۔ اب انشاءاللہ آپ کی آواز ہر گھر میں سنائی دے گی۔ اس سے اصلاح کے کام میں بہت مدد ملے گی۔ یہاں کیسٹ کی بے انتہا ضرورت ہے۔ کیوں کہ لکھے لیے کیسٹ بہت موزوں ہوتے ہیں" (۵ اگست ۱۹۸۵)

۱۴۔ تذکیر القرآن (جلد دوم) کی تیاری خدا کے فضل سے مسلسل جاری ہے۔ سورہ الروم (پارہ ۲۱) تک لکھی جا چکی ہے۔ تحریر اور کتابت کی تکمیل کے بعد انشاءاللہ وہ فوراً چھاپ دی جائے گی۔

۱۵۔ "حل یہاں ہے" اور "فسادات کا مسئلہ" دو الگ الگ کتابیں تھیں۔ اب ان دونوں کتابوں کو مزید اضافہ کے ساتھ ملا کر ایک کتاب شائع کی گئی ہے جس کا نام ہے —— "حل یہاں ہے"، یہ دونوں کتابیں الگ الگ بھی دستیاب ہیں اور ان کا یکجائی اڈیشن بھی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متنوع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارنبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ
کیسٹ

الرسالہ کیسٹ کی روانگی شروع ہوگئی ہے
انفرادی خریدار اطلاع بھیج کر جلد اپنی خریداری درج کرادیں۔
جو حضرات اس کی ایجنسی لینا چاہیں
وہ بھی اپنی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔
الرسالہ کیسٹ کی ایجنسی کم از کم پانچ کیسٹوں پر دی جائے گی۔

کمیشن :

۲۵ کیسٹ تک — ۲۰ فی صد

۲۵ کیسٹ سے زیادہ — ۲۵ فی صد

(ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ)

الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

October 1985
Number 107

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128